جلد ۸۷ جون سنہ ۱۹۰۰ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے اجزاء

تفسیر پارۂ اول	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- ″
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ ″
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- ″
تفسیر سورہ لقمان	۲/- ″
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ ″
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ ″
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ ″
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ ″

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	جون ۱۹۷۷ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۳۹۷ھ	جلد ۸۷

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ممکن ہے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بعض سطح بین افراد کی نظر میں قومی اتحاد کی موجودہ تحریک اقتدار کی رسّہ کشی یا محض کرسی کا تنازعہ ہو، لیکن جو لوگ حالات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کے عادی ہیں، وہ اِس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ یہ کرسی کا مسئلہ نہیں بلکہ عوام کے اِس ناقابلِ شکست عزم اور پختہ ارادے کا اظہار ہے کہ اب وہ اِس ملک میں کسی طاغوتی طاقت کو ظالمانہ اور جابرانہ کارروائیوں کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اِس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے اور اِس ملک کے حکمرانوں کو جھنجھوڑ کر بتا دیا جائے کہ اِس سرزمین میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کی عملداری قائم نہیں ہوسکتی اور اسلام بھی وہ جو مسلمانوں کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے توسط سے ملا ہے اور جس کی جھلک خلفائے راشدینؓ کے بابرکت دَور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

برِصغیر ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں کروڑوں افراد اب بھی ایسے موجود ہیں جنھوں نے پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے دیکھا۔ وہ اِس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ اِس ملک کے قیام کی غرض بجز اِس کے اور کوئی نہ تھی کہ اِسے اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنایا جائے اور دینِ حق نے نوعِ انسانی کو حکومت و مملکت، معاشرت و معیشت اور اخلاق و تہذیب کے جو اُصول دیے ہیں اُنہیں اِس خطۂ پاک میں عملاً نافذ کر کے دنیا کو یہ دکھایا جائے کہ یہ اصول کس قدر صحیح، کس قدر متوازن اور کس قدر قابلِ عمل اور حیات آفرین ہیں اور اُنہیں اپنانے سے نوعِ انسانی کے اندر پھیلے ہوئے فسادات کس آسانی کے ساتھ دُور ہو سکتے ہیں اور

ظلم و استبداد کی چکی میں پِسا ہوا یہ کرۂ ارضی کس تیزی کے ساتھ امن و انصاف کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

جس طرح قیامِ پاکستان کا مقصد سب لوگوں پر پوری طرح واضح ہے، اِسی طرح یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے جمہوری راستہ ہی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اسلام نے فرد کی آزادی کا جس حد تک احترام کیا ہے، اُمورِ مملکت چلانے میں اُسے جس طرح شریک بنایا ہے اور اُس کے حقوق کی جس انداز سے پاسبانی کی ہے، اُس نے جمہوری روایات کو مسلم قوم کے رگ و پے میں پوری طرح راسخ کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے طویل دَورِ حکومت میں اگر کسی حکمران نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے عوام کے حقوق پامال کرنے کی کوشش کی تو نہ صرف وقت کے علمائے ربانی بلکہ عوام نے بھی ایسی پامردی اور ہمت سے اُس کا مقابلہ کیا کہ اُسے اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنا پڑا۔ پھر انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جو جدوجہد کی، اُس کا نہج کم و بیش جمہوری ہی رہا۔ خصوصاً تحریکِ پاکستان کا مزاج تو سرتاپا جمہوری تھا۔ اِس لیے اگر مسلمان ملوکیت کے زیرِ سایہ ایک طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے اپنی جمہوری روایات سے کسی حد تک ناآشنا ہو بھی چکے تھے تو انگریز کے خلاف جمہوری انداز میں کامیاب جدّوجہد کی وجہ سے وہ اُن روایات سے از سرِ نو پوری طرح باخبر ہو گئے اور اُنھوں نے اِنھیں اپنی متاعِ گم گشتہ سمجھتے ہوئے بڑے اشتیاق کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ قوم اِس بات پر پوری طرح متحد و متفق تھی کہ پاکستان اسلام کے نظامِ اجتماعی کا ترجمان ہو گا اور اِس میں سارے معاملات جمہوریت کے معروف طریقوں سے طے کیے جائیں گے۔

یہ پاکستانی قوم کا المناک سانحہ ہے کہ اِس ملک کے قیام کے بعد جس طبقے کے ہاتھ میں اِس کی زمامِ کار آئی، وہ مغربی تہذیب و تمدّن کا دلدادہ ہونے کی وجہ سے اسلام سے کَدّ رکھتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر یہاں اسلام نافذ ہوا تو اُس کی کبریائی قائم نہ رہ سکے گی، اِس لیے اُس نے آغاز ہی سے اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ایک طرف اُس نے دینِ حق کے بارے میں پڑھے لکھے طبقے کے اندر بدگمانیاں پھیلانے کا وسیع سلسلہ شروع کیا اور اِس ضمن میں ہر اُس گمراہی کی پوری ڈھٹائی کے ساتھ

سرپرستی کی جس سے اسلام کی قوت کمزور ہو، دوسری طرف ملک کے اندر ایسے فشاری گروہ (PRESSURE GROUPS) قائم کیے جو مختلف طریقوں سے اور مختلف سطحوں پر اثر انداز ہو کر معاشرہ کو اسلام سے دُور لے جائیں۔ اِس اسلام دشمن طبقہ نے جتنی قوت سے اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کی، اس سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ جمہوریت کو ناکام بنانے اور فسطائیت کا تسلط قائم کرنے کے لیے سرگرمی دکھائی۔ اُسے اِس امر کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اِس ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں تو یہاں اسلام کے سوا کسی دوسرے نظام کو پنپنے کا موقع نہیں مل سکے گا، کیونکہ اِس ملک کی عظیم اکثریت اِس بات پر پختہ یقین رکھتی ہے کہ اسلامی نظام ہی اُس کے سارے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے۔ اکثریت کے اِس اندازِ فکر کے ساتھ ائمۃ الکفر کی سیادت آخر کس طرح قائم رہ سکتی ہے؟ چنانچہ اِس ملک کے سارے بے دین عناصر نے اسلام کی مخالفت کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی بیخ کنی کو بھی نہایت ضروری سمجھا اور ملک کے اندر فسطائیت کی راہ ہموار کرنے میں جو کردار وہ ادا کر سکتے تھے اُسے پوری طرح ادا کیا۔ اُنہوں نے ہر آمر کی پوری قوت سے تائید کی اور اس نے انسانی حقوق غصب کرنے کے لیے جو شرمناک کھیل کھیلا اور جس نسبت سے عدل و انصاف کی حدود کو پامال کیا، اُسی نسبت سے اسلام کے اِن بدخواہوں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

اگر کوئی شخص پاکستان کی تیس سالہ تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہے تو وہ بڑی آسانی سے یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ بے دین اور آمرانہ مزاج مگر صاحب اختیار اقلیت اور اسلامی نظام کے قیام کی آرزومند مگر بے اختیار عظیم اکثریت کے درمیان طویل کشمکش کی ایک دلفگار داستان ہے۔ یہ اقلیت چونکہ کسی جائز اور معقول طریقے سے اکثریت پر مسلط نہیں رہ سکتی تھی لہذا اقتدار پر قابض رہنے کے لیے اُسے وہ سارے ظالمانہ ہتھکنڈے بے دریغ استعمال کرنے پڑے جن کی مدد سے اُس کا عوام کی گردنوں پر مدت تک اُن کی خواہش کے علی الرغم مسلط رہنا ممکن ہو سکتا تھا۔ اِس بنا پر اگر پاکستان کی تاریخ کو وحشتناک ظلم، انسانی ضمیر کی موت، عوام کی بے بسی اور حاکمانہ استبداد کی روح فرسا سرگذشت کہا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔

اِس وقت پاکستان میں مستبد حکومت، جو بے دین اقلیت کی ترجمان ہے، کے خلاف قومی اتحاد کی جو زبردست تحریک چل رہی ہے اور جس میں عوام نے بے مثال جرأت، پامردی، ایثار اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا ہے، اُس کا محرک صرف مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں دھاندلیوں کی شکایت نہیں، بلکہ اُس کا محرک ایک گہرا اضطراب ہے جس نے گذشتہ تیس سال کی مسلسل ناانصافیوں، زبردست آزاریوں اور محرومیوں کے بطن سے جنم لیا ہے۔ سخت غلطی پر ہیں وہ لوگ جو اِس فقید المثال عوامی تحریک کو محض کرسی کا جھگڑا سمجھتے ہوئے اِس کی غیر معمولی اہمیت اور اِس کے وسیع اور گہرے اثرات کو جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ حالیہ انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلیوں نے لوگوں کے اندر خوفناک ہیجان پیدا کر دیا، جس سے یہ لاوا بالآخر ایک عوامی تحریک کی صورت میں بر نکلا۔ لیکن یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ اِس ہیجان میں غیر معمولی شدت محض انتخابات میں ناانصافیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی عوام برسوں سے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے، اُن کی زندگی ایک کربناک عذاب کی صورت اختیار کر چکی تھی جس میں ہر لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اِس اعصاب شکن صورتِ حال سے نجات حاصل کرنے کے شدید آرزومند تھے۔ ان اندوہناک حالات میں انہیں مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اُمید کی ایک کرن دکھائی دی۔ وہ اِس آس پر جینے لگے کہ انہیں ووٹ کے ذریعہ پُرامن طریقے سے اِس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک نادر موقع ہاتھ لگا ہے جس سے انہیں بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ چنانچہ اُنہوں نے پاکستان قومی اتحاد کی صورت میں اپنی ساری سیاسی قوت مجتمع کر کے ایک ایسی قیادت کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں جو اسلام پر گہرا اور پختہ یقین رکھتی ہو اور دینی نظام کے قیام کی خود بھی دل و جان سے متمنی ہو اور اُسے اپنی قوم اور پوری انسانیت کی فلاح کی واحد ضمانت سمجھتی ہو۔ پھر وہ اقتدار کو اپنی کوئی مستقل جاگیر بھی تصور نہ کرے اور رائے عامہ کے احترام میں اُس سے بلا چون و چرا الگ ہونے پر بھی آمادہ ہو تاکہ مسلم قوم کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ظالم آمروں سے چھٹکارا حاصل کرنے ہی میں ضائع نہ ہوتی رہیں، بلکہ انہیں تعمیر و ترقی کے مختلف میدانوں میں استعمال کیا جا سکے۔

اِن انتخابات میں پاکستانی عوام کو اپنی ملّی آرزوئیں پروان چڑھتی نظر آتی تھیں۔ اُنہیں اِس بات کا

پختہ یقین تھا کہ وہ اگر سلیقے اور انصاف کے ساتھ اِن فیصلہ کُن مراحل سے گذر گئے تو تیس سال کی طویل مدّت تک فکر و عمل کی ظلمتوں میں بھٹکنے کے بعد اُن کی زندگی اسلام سے منوّر ہونا شروع ہو جائے گی اور وہ مقصد و منہاج کے معاملے میں یکسو ہو کر اُس نقطہ پر آجائیں گے جہاں اسلام اور جمہوریت سے انحراف کا آغاز ہوا تھا۔ اِس بنا پر اہلِ پاکستان اِس مرتبہ انتخابات کے معاملے میں جس قدر سنجیدہ تھے اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ وہ خود غرض اور آبرو باختہ حکمرانوں، بگڑے ہوئے فوجی آمروں اور عوام کے سطحی جذبات سے کھیلنے والے عوام دشمن قائدین کی چیرہ دستیوں سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ لہٰذا وہ گذشتہ تیس سالوں کے تلخ تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی قسمت کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے لیے بے تاب تھے اور اِس بات کے شدید آرزومند تھے کہ اب کے وہ ملک کی زمامِ کار نیک، ایماندار، خداترس اور قوم کے حقیقی بہی خواہوں کے ہاتھ میں منتقل کریں گے تاکہ وہ اُن وعدوں کی تکمیل کر سکیں جو ہندوستان کے مسلمانوں نے تشکیلِ پاکستان کے وقت خُدا اور خلق کے سامنے کیے تھے۔

آرزو جب شدید ہو اور اُس کے پورا ہونے کے امکانات بھی قوی ہوں تو اس صورت میں اگر کوئی فرد یا گروہ اُس کا خون کر دے تو اُس کے خلاف انسان کے دل و دماغ میں نفرت و حقارت کا زبردست طوفان اُٹھتا ہے۔ یہی صورتِ حال گذشتہ انتخابات میں پیش آئی۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ ملک کی انتظامیہ نے ایک ہمہ مقتدر ذات کے اشارۂ ابرو پر عوامی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کر دیا ہے تو انہوں نے اِس المیہ کو اُسی فرطِ غم سے محسوس کیا جس سے ایک انسان اپنے لختِ جگر کے قتلِ ناحق کو محسوس کرتا ہے۔ فرد کا قتل تو ایک خاندان کی بدنصیبی ہوتی ہے، اِس لیے ایک خاندان کے افراد ہی اُس پر آہ و زاری کرتے ہیں، لیکن جب کسی قوم کی اجتماعی آرزوؤں اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا جائے تو پورے مُلک میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے اور اُس حزنیہ پر ہر فرد نوحہ کناں ہوتا ہے۔ اِس زاویے سے اگر دیکھا جائے تو قومی اتحاد کی موجودہ تحریک ایک جابر فرمانروا کے ہاتھوں ملّی اُمنگوں کی حسرتناک موت پر اہلِ پاکستان کی اجتماعی نوحہ خوانی ہے۔

کہتے ہیں قُقنُس جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو اُس راکھ سے ایک نیا قُقنُس جنم لیتا ہے۔ اِسی طرح آرزوؤں کے مدفن سے بعض اوقات حیات آفرین اُمیدوں کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ مارچ ۱۹۷۷ء

کے انتخابات میں اگرچہ عوامی اُمنگوں کا بے دریغ خون کیا گیا۔ لیکن اُسی خاک و خون سے ایسے تازہ ولولوں نے جنم لیا جنہوں نے قوم کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور وہ نئے عزائم اور ارادوں کے ساتھ سرگرم عمل ہوئی، جس کی پہلی علامت یہ ہے کہ معاشرے میں فکری اور جذباتی ہم آہنگی کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ واضح طور پہ دو گروہوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے، ایک اسلام سے مخلصانہ وابستگی رکھنے والا مضبوط گروہ، اور دوسرا اسلام کے خلاف سینوں میں کدورت پالنے والا بد اندیش افراد کا ایک مختصر سا ٹولہ۔ موجودہ حکومت سے پہلے اس ملک میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں انہوں نے اسلام کے بارے میں بظاہر خاموش تماشائی کا سا طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا جس کی وجہ سے اس معاشرے میں منافقین کو پھلنے پھولنے کے بڑے مواقع میسر ہوئے اور یہ مارِ آستین کی طرح بڑی خاموشی کے ساتھ اس غریب معاشرے کا لہو بھی پیتے رہے اور اس کے اندر اپنا زہر بھی پھیلاتے رہے۔ بھٹو صاحب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملک کے اندر ایک ایسی معاشرتی فضا قائم ہوگئی جس میں آستین کے ان سانپوں کو اس بات کی جرأت ہوئی کہ وہ چھپ کر نہیں بلکہ آستینوں سے باہر آ کر اس قوم کے جسدِ اجتماعی میں اپنا زہر سرایت کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے ان سازگار حالات سے پورا پورا فائدہ اُٹھا کر اپنی یہ ناپاک حرکت اس زور و شور کے ساتھ شروع کی کہ پورا معاشرہ ان کی زہرناکیوں سے تلملا اُٹھا اور عوام اپنے دشمنوں کو اچھی طرح سے پہچاننے لگے۔ انتخابات کے موقع پر لوگوں کو اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ یہ اژدہے کس کس طبقے میں پائے جاتے ہیں اور وہاں انہیں کس قدر قوت حاصل ہے اور یہ کس جانب سے اور کس شدت کے ساتھ مختلف محاذوں سے حملہ کرتے ہیں۔

قومی اتحاد کی حالیہ تحریک کی وجہ سے پورے معاشرے میں جو زبردست ہلچل پیدا ہوئی ہے اس نے ملت کے بہی خواہوں اور بدخواہوں کے درمیان اس حد تک واضح امتیاز پیدا کر دیا ہے کہ اب اُنہیں پہچاننے میں کسی فرد کو کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ اُن کی علامات نہایت واضح ہیں اور ہر شخص اُنہیں دیکھ کر اس امر کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ مخالف اسلام اور ملت دشمن افراد کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کا طریقِ واردات کیا ہے؟ ہم یہاں اُن کی چند نمایاں علامات بیان کریں گے۔

اُن کی پہلی علامت یہ ہے کہ وہ اسلام کے معاملے میں کبھی مخلص نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ اُس کے خلاف

تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔ اگر کسی مجبوری کے عالم میں اُنہیں اسلام کے متعلق کوئی کلمۂ خیر کہنا ہی پڑے تو اُسے اِس انداز سے کہتے ہیں جیسے اُن پر کوئی ناروا بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ پھر یہ لوگ اُس کلمۂ خیر کو کسی ایسی غلط توجیہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ کلمۂ حق اپنے مضمرات کے اعتبار سے کلمۂ باطل معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا استہزا اور اسلامی روایات پر طنز و تعریض اِن لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے، خصوصاً مذہبی رہنماؤں کو ہدفِ تنقید بنانے اور اس طرح اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں چھپے ہوئے کینہ کو ظاہر کرنے میں وہ بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔

مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں علمی نوعیت کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں اُنہیں بھیانک صورت میں پیش کرنے اور اُن فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے میں ملّت کے اِن بدخواہوں کو بڑا لطف آتا ہے۔ پھر اُمت کی عظیم اکثریت نے جن مذہبی گروہوں پر ضلالت اور گمراہی کی مہر ثبت کر دی ہے یا جنہیں اجماعِ اُمت کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے، اُن کے موقف کی حمایت اور پوری اُمت کی مخالفت اسلام کے اِن دشمنوں کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔

اِن منافقین کے تحت الشعور میں چونکہ یہ چبھتا ہوا احساس موجود رہتا ہے کہ اسلام کے خلاف ان کا معاندانہ اندازِ فکر اور منافقانہ طرزِ عمل ملّت کو کسی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں اور اُس کے اجتماعی ضمیر سے مغائرت رکھتا ہے، اِس لیے وہ مسلم معاشرے میں رہتے ہوئے اُس سے بُعد محسوس کرتے ہیں۔ اپنے ہی بھائی بندوں سے یہ بیگانگی اُن کے اندر احساسِ کہتری پیدا کرتی ہے جس کی تسکین کے لیے ان کے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ پہلے تو حکومت کی مدح سرائی کرکے اُس کا تحفظ حاصل کیا جائے، پھر اُس کے تعاون سے مسلمانوں کے ملّی جذبات کو کچوکے لگائے جائیں۔ مسلم معاشرے سے اُنہیں کس قدر نفرت ہے، اُس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہر ظالم اور جابر حکومت کی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حمایت کی اور اُس سے بے شمار دُنیوی مفادات حاصل کیے اور جابر فرمانرواؤں نے جب بھی عوام کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا تو مظلوموں اور ستم زدوں کے اِن جھوٹے بہی خواہوں نے حکومت کا ہاتھ روکنے کے بجائے آفت زدوں ہی کو اُلٹا موردِ الزام ٹھیرایا۔ مفاد پرستی نے اِس ناپاک گروہ کو اِس حد تک جذبۂ عدل سے بیگانہ کر دیا ہے کہ اُنہیں ویٹنام اور شکاگو کے مظلوموں کی مظلومیت پر تو ترس آجاتا ہے اور ان کے دل میں ظالموں کے خلاف نفرت کے (باقی بر صفحہ ۴۸)

ہجرت اِلَی المدینہ

(۳)

مدینے میں حضورؐ کا استقبال

بخاری و مسلم اور مُسند احمد میں حضرت بَراءؓ بن عازب کے واسطے سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب ہم مدینے پہنچے تو لوگ ہمارے استقبال کے لیے سڑکوں پر نکل آئے، چھتوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، خدام اور لڑکے راستوں میں دوڑتے پھرتے تھے اور نعرے لگا رہے تھے اللہ اکبر، رسولؐ اللہ تشریف لے آئے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو سلاح بند مجمع نے گھیر رکھا تھا، لوگ اُونچی جگہوں پر چڑھ کر آپ کو دیکھنے کے لیے نگاہیں دوڑا رہے تھے اور سارے شہر میں آ گئے نبیؐ اللہ، آ گئے رسولؐ اللہ کا شور مچ رہا تھا۔ طبقات ابن سعد میں حضرت انس کی روایت کے جو الفاظ منقول ہوئے ہیں ان میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا روشن اور شاندار دن نہیں دیکھا۔ مُسند احمد میں حضرت انسؓ کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ مدینہ استقبال کے لیے اُمڈے چلے آ رہے تھے، عورتیں چھتوں پر جمع ہو گئی تھیں، اور لوگوں سے پوچھ رہی تھیں کہ ان دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں۔ ایسا منظر ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ اِسی سے ملتے جُلتے مضمون کی روایات حضرت انس سے دارمی، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور بیہقی میں بھی منقول ہیں۔ بخاری میں حضرت بَراءؓ بن عازب کا بیان ہے کہ میں نے اہلِ مدینہ کو کبھی اس قدر خوش و خرم نہیں دیکھا جس قدر حضورؐ کی تشریف آوری کے دن دیکھا تھا۔

بیہقی نے دلائل میں اور ابوبکر المقریٔ صاحب مُعجم الکبیر نے کتاب الشمائل میں یہ روایت بیان کی ہے کہ عورتیں چھتوں پر چڑھ کر یہ گیت گا رہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَىٰ لِلّٰهِ دَاعٍ

ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا وداع کی پہاڑیوں سے۔ ہم پر شکر واجب ہے جب تک کوئی اللہ کو پکارنے والا باقی ہے۔

رزین نے اس کے ساتھ ایک شعر اور بھی نقل کیا ہے:

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

اے ہمارے اندر مبعوث ہونے والے، تو وہ منصب لے کر آیا ہے جو واجب الاطاعت ہے۔

ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں اس روایت کو اس بنا پر رد کر دیا ہے کہ ثَنِيَّاتُ الْوَدَاع (یعنی وہ پہاڑی راستے جن تک اہل مدینہ سفر پر جانے والوں کو رخصت کرنے کے لیے جاتے تھے) شام کی طرف تھے نہ کہ اس کے بالکل مخالف رخ پر مکہ کی جانب۔ اور یہ اشعار خواتین نے اس وقت گائے تھے جب حضورؐ تبوک سے واپس تشریف لائے تھے، جیسا کہ بخاری، ابوداؤد اور ترمذی میں مذکور ہے۔ حالانکہ یہ کوئی بعید از امکان بات نہیں ہے کہ مکہ کی طرف جانے والے مسافروں کو جن پہاڑی راستوں تک رخصت کرنے کے لیے اہلِ مدینہ جاتے ہوں ان کو بھی ثَنِيَّاتُ الْوَدَاع کہا جاتا ہو۔ ثَنِيَّة تو ہر اس راستہ کو کہتے ہیں جو پہاڑوں میں سے گزرتا ہو۔ اور کسی راستے کو ثَنِيَّةُ الْوَدَاع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "وہ پہاڑی راستہ جس پر باہر جانے والے مسافروں کو رخصت کیا جائے"۔ ایسا راستہ جس طرح شام کی طرف جانے والوں کے لیے تھا، اسی طرح مکے کی طرف جانے والوں کے لیے بھی تھا۔ شیخ سمہودی نے وفاء الوفا میں اس اعتراض کا ایک دوسرا جواب دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں بنی ساعدہ کی طرف سے داخل ہوئے تھے اور وہ شام کی جانب تھا۔

حضورؐ جب بنی النجار کے محلے میں پہنچے تو لڑکیاں دف بجاتی ہوئی نکل آئیں اور وہ یہ گیت گانے لگیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ

ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں کیا ہی اچھے ہمسایے ہیں محمدؐ

اس کو حاکم اور بیہقی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ حضورؐ نے لڑکیوں سے پوچھا "کیا تم مجھ سے محبت رکھتی ہو؟" انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔ آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا، خدا کی قسم میں تم لوگوں (یعنی

انصار) سے محبت رکھتا ہوں۔ طبرانی نے المعجم الصغیر میں حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اللہ جانتا ہے کہ میرا دل تم لوگوں سے محبت رکھتا ہے"۔ بیہقی اور ابن ماجہ نے بھی اس کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ بخاری میں حضرت انس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے لڑکیوں اور عورتوں کو آتے دیکھا تو آپ کھڑے ہو گئے اور تین مرتبہ فرمایا "بخدا تم لوگ مجھے سب سے بڑھ کر محبوب ہو"۔

قریش کی جھنجلاہٹ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بخیریت مدینے پہنچ جانا ہی کفارِ قریش کے لیے سخت پریشان کن تھا۔ مگر جب انہیں مدینے میں حضورؐ کے اس شاندار استقبال کی خبر پہنچی تو وہ بُری طرح تلملا اٹھے اور انہوں نے مدینے کے سردار عبداللہ بن اُبَی کو (جسے ہجرت سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر حضورؐ کے مدینہ پہنچ جانے اور اَوس و خزرج کی اکثریت کے مسلمان ہو جانے سے پانی پھر چکا تھا) خط لکھا:

"تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اُس سے لڑو یا اُسے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمہارے مردوں کو قتل اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے"۔

عبداللہ بن اُبَی اِس پر کچھ آمادۂ شر ہوا، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بروقت اس کے شر کی روک تھام کر دی۔ پھر حضرت سعد بن مُعاذ رئیسِ مدینہ عُمرے کے لیے مکے گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے ان کو ٹوک کر کہا الا اراک تطوف بمکۃ امنا وقد اویتم الصباۃ وزعمتم انکم تنصرونھم وتعینونھم؟ اما واللہ لولا انک مع ابی صفوان ما رجعت الی اھلک سالمًا۔ "یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم اطمینان سے مکے میں طواف کر رہے ہو حالانکہ تم نے ہمارے مرتدوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور تم ان کی مدد و اعانت کا دم بھرتے ہو؟ بخدا اگر تم ابوصفوان (یعنی اُمیہ بن خلف) کے ساتھ نہ ہوتے تو زندہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے"۔ حضرت سعد نے جواب میں کہا واللہ لئن منعتنی ھذا لامنعنک ما ھو اشد علیک منہ طریقک علی المدینۃ۔ "بخدا اگر تم نے مجھے طواف کعبہ سے روکا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لیے اس سے شدید تر ہے، یعنی مدینہ پر سے تمہاری رہ گذر"[1]۔

---

[1] یہ بخاری میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے جو انہوں نے خود حضرت سعدؓ بن معاذ سے (باقی برصفحہ ۱۶۰)

یہ گویا اہلِ مکہ کی طرف سے اِس بات کا اعلان تھا کہ زیارت بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پہ بند ہے، اور اِس کا جواب اہلِ مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفین اسلام کے لیے پُرخطر ہے۔ اِس معاملہ نے واضح کر دیا کہ آئندہ حالات کیا رُخ اختیار کرنے والے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱) سُن کر بیان کی ہے۔ اِس میں یہ تصریح ہے کہ زمانۂ جاہلیت سے اُن کے اور اُمیّہ بن خلف کے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب وہ مدینے آتا تو اُن کے ہاں ٹھیرتا، اور جب یہ مکّے جاتے تو اُس کے ہاں قیام کرتے۔ اسی دوستی کی بنا پر حضرت سعدؓ عمرے کے لیے مکّے گئے تھے اور انہوں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے ایسے وقت طواف کرا دو جب حرم خالی ہو۔ چنانچہ دوپہر کو اُمیّہ اُن کو طواف کے لیے لے گیا، مگر وہاں ابوجہل مل ہی گیا، اور اُن سے اس کی وہ گفتگو ہوئی جو ہم نے اُوپر درج کی ہے۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت سعدؓ نے ابوجہل کو یہ سخت جواب دیا تو اُمیہ نے ان سے کہا "ابوالحکم سے سخت کلامی نہ کرو، یہ اِس وادی کے لوگوں کا سردار ہے"۔ حضرت سعدؓ نے کہا "چھوڑو بھی، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ یہ لوگ تمہیں قتل کردیں گے"۔ اُمیّہ یہ سُن کر سخت پریشان ہوگیا، اور اس نے پوچھا کیا یہ لوگ مکہ میں مجھے قتل کریں گے؟" حضرت سعدؓ نے کہا یہ میں نہیں جانتا۔ مُسند احمد میں اس قصّے کی جو روایت بیان ہوئی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ اُمیّہ نے حضرت سعدؓ کا یہ قول جب اپنی بیوی کو سُنایا تو اُس نے کہا "خدا کی قسم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جھوٹ نہیں بولتے"۔ حافظ ابوبکر بزّار اپنی مُسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی جو روایت لاتے ہیں اس میں اُمیّہ بن خلف کے بجائے عُتبہ بن رَبیعہ کا ذکر کیا گیا ہے، اور یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت سعدؓ کو جب اُس نے ابوجہل کے ساتھ سخت کلامی کرنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ وہ (یعنی حضورؐ خود) تم کو قتل کرنے والے ہیں۔ یہ سُن کر عُتبہ کے چھکّے چھوٹ گئے اور اس نے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات جھوٹی نہیں ہوسکتی"۔ اگرچہ بزّار کی اس حدیث کے راوی بھی ثقہ ہیں، لیکن صحیح بات وہی ہے جو بخاری کی روایت میں بیان ہوئی ہے۔ اُمیّہ بن خلف جنگِ بدر میں نکلنے کے لیے تیار نہ تھا، قریش کے لوگ اُسے طعنے دے دے کر لائے تھے، اور وہ حضورؐ کے ہاتھ سے نہیں بلکہ گرفتار ہونے کے بعد حضرت بلالؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ رہا وہ شخص جس کو حضورؐ نے خود قتل کرنے کے لیے فرمایا تھا تو وہ اُمیہ بن خلف نہیں بلکہ اُبی بن خلف تھا اور وہ جنگِ اُحد میں حضورؐ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

مسجدِ نبوی کی تعمیر حضرت ابوایوب انصاری کے ہاں آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جس چیز کی فکر فرمائی وہ یہ تھی کہ ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ آپ کی اونٹنی جس جگہ جا کر ٹھیری تھی، ابن سعد کی روایت کے مطابق وہاں مسلمان پہلے سے نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ اسعدؓ بن زُرارہ وہاں جماعت کراتے تھے، اور جمعہ بھی وہاں ہوتا تھا۔ یہ دو یتیموں سَہل اور سُہَیل کی زمین تھی جو حضرت اسعدؓ بن زُرارہ کی سرپرستی میں تھے۔ یہی بخاری میں حضرت عُروَہ بن زبیر اور سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق کی روایت ہے۔ اور بلاذری نے فتوح البُلدان میں اسے قولِ مشہور کی حیثیت سے نقل کیا ہے۔ (ابن اسحاق کی روایت میں حضرت مُعاذؓ بن عَفراء کو ان کا سرپرست بیان کیا گیا ہے، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ دونوں حضرات ان کے سرپرست تھے)۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ اور عُروَہ بن زبیر کی روایت ہے، اور سیرت ابن ہشام میں ابن اسحاق کی روایت بھی یہی ہے کہ اس زمین میں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن جریر کی روایت ہے کہ اس میں کچھ کھجور کے درخت تھے کچھ زیرِ کاشت زمین (اور بعض روایتوں میں ہے کچھ خرابے کی زمین) تھی اور کچھ مشرکین کی پرانی قبریں تھیں۔ حضرت عائشہؓ اور عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ان لڑکوں سے زمین کی قیمت کے متعلق بات کی۔ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم اسے ہبہ کیے دیتے ہیں، مگر آپ نے ہبہ قبول نہ فرمایا اور اسے قیمتہً خریدا۔ موسیٰ بن عُقبہ کی روایت امام زُہری سے یہ ہے کہ حضورؐ نے اسے دس دینار میں خریدا۔ واقدی سے ابن سعد کی روایت بھی یہی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ قیمت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ادا کی۔ فتوح البُلدان میں بَلاذری نے بھی یہی لکھا ہے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت مُعاذ بن عَفراء نے عرض کیا آپ یہاں مسجد بنالیں، میں ان بچوں کو راضی کرلوں گا (اس میں یہ واضح نہیں ہے کہ انہوں نے بچوں کو خود قیمت دے کر راضی کرنا چاہا تھا یا حضورؐ سے قیمت قبول کر کے آپ کے ہاتھ فروخت کرنے پر راضی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا)۔

بخاری اور ابوداؤد میں حضرت انس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے بنی نَجّار کو کہلا بھیجا کہ مجھ سے اپنے اس باغ[1] کی قیمت طے کرلو۔ انہوں نے کہا ہم اللہ کے سوا اس کی قیمت کسی سے نہیں چاہتے۔ اس روایت

---

[1] اصل میں لفظ حائط استعمال ہوا ہے جو ایسے باغ کے لیے بولا جاتا ہے جس کے گرد چاردیواری ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین پہلے ایک باغ تھی پھر باغ اُجڑ گیا اور وہ مختلف کاموں کے لیے استعمال ہونے لگی، جیسا کہ اوپر نقل کردہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔

میں یہ تصریح نہیں ہے کہ زمین قیمتہً خریدی گئی یا ہبہ قبول کر لیا گیا۔ لیکن دوسری تمام روایتیں اِس پر متفق ہیں کہ مسجد نبوی کی زمین بلا قیمت نہیں لی گئی تھی۔

زمین حاصل کرنے کے بعد اس زمین کو صاف کیا گیا، خرابے کو ہموار کیا گیا، قبریں اُکھاڑ دی گئیں، کھجور کے درخت کاٹ کر ان کے تنوں سے مسجد کے لیے ستون بنا لیے گئے، کھجور کے پتوں کی چھت ڈال لی گئی۔ کچی اینٹوں اور گارے سے دیواریں تعمیر کر لی گئیں، اور خالی زمین کا فرش رہنے دیا گیا۔ بعد میں جب بارش سے کیچڑ ہونے لگی تو کچے فرش پر کنکریاں بچھا دی گئیں، اور جب کھجور کے پتوں کی چھت کے نیچے گرمی ستانے لگی تو اُوپر گارے کی لپائی کرا دی گئی۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ اور عُروہ بن زبیرؒ اور ابوداؤد میں حضرت انسؓ اور سیرت ابن ہشام میں محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ مسجد کی اس تعمیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سب کے ساتھ اینٹیں اور گارا ڈھونے کا کام کیا۔

حضورؐ کے حجروں کی تعمیر

مسجد نبوی سے متصل ہی حضورؐ نے ایک جانب اپنے لیے دو گھر بنائے، ایک حضرت سودہؓ کے لیے، اور دوسرا حضرت عائشہؓ کے لیے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ گھر بھی کچی اینٹوں کے تھے، کھجور کی ٹٹّیوں پر گارے کا لیپ کر کے حجرے الگ الگ کیے گئے تھے، کھجور کے پتوں ہی کی چھت ڈالی گئی تھی، اور دروازوں پر کمبل ڈال دیے گئے تھے۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ میں لڑکپن میں بلوغ سے پہلے حضورؐ کے گھروں میں گیا ہوں۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ میں ہاتھ اُٹھا کر ان کو چھو سکتا تھا۔ امام بخاری نے تاریخ میں اور حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مُسند میں لکھا ہے کہ حضورؐ کے دروازوں کو انگلیوں کے ناخنوں سے ٹھونکا جاتا تھا، کیونکہ ان میں کنڈیاں نہ تھیں۔

اہل و عیال کو مکّہ سے بلانا

حضرت زید بن ثابت سے واقدی کی روایت ہے کہ حضورؐ حضرت ابو ایوبؓ کے ہاں ۷ مہینے مقیم رہے۔ ابن سعد اور بلاذری نے اسے نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اس کی توثیق کی ہے۔ اِس دوران میں، قبل اس کے کہ حضورؐ اپنے گھروں میں منتقل ہوتے، آپؐ نے حضرت زید بن حارثہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام ابو رافعؓ کو ۵ سو درہم اور دو اُونٹ دے کر مکّے بھیجا تا کہ وہ آپؐ کے اہل و عیال اور متعلقین کو لے آئیں۔[1] اِن دونوں کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ نے عبد اللہ بن اُریقط

---

[1] بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ پانچ سو درہم حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے لیے تھے۔

کو اپنے صاجزادے عبداللہ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی والدہ اور بہنوں کو لے آئیں۔ زیدؓ بن حارثہ ام المومنین حضرت سودہؓ کو حضور کی دو صاجزادیوں حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو، اور اپنی بیوی امّ ایمنؓ اور اپنے صاجزادے اُسامہ بن زید کو لے آئے، مگر حضرت زینبؓ کو نہ لا سکے کیونکہ اُن کے شوہر ابوالعاص بن رَبیع نے ان کو روک لیا۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ انہی لوگوں کے ساتھ اُمّ رُومانؓ اور حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو لے آئے (طَبرانی، ابن سعد، بلاذری، ابن عبدالبرؒ)۔

یہاں پہنچ کر اسلامی تحریک کا مکّی دَور ختم ہوا۔ آئندہ صفحات میں ہم اس پر ایک مختصر تبصرہ کریں گے۔

باب ۱۴

مکّی دَور پر ایک مجموعی نظر

اب ہمیں پیچھے پلٹ کر مکّی دَور کے آغاز سے ہجرت تک کی تاریخ پر ایک مجموعی نظر ڈال کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی تحریک ابتدا میں کیا سرمایہ لے کر اٹھی تھی، ۱۳ سال کی مدت میں اس سرمایہ کے اندر کس کس نوعیت کے اضافے ہوئے، اور جب یہ مدنی دَور میں داخل ہوئی تو اس کے پاس کیا سرمایہ تھا جس سے کام لے کر اُسے مکّی دَور کے حالات سے بالکل ہی مختلف، دوسری قسم کے حالات میں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی کرنی تھی۔

اس تحریک کا ابتدائی، یا صحیح تر الفاظ میں بنیادی، سرمایہ صرف محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، آپ کی شخصیت، اور آپ کی نبوت سے پہلے کی چہل سالہ زندگی تھی۔

حضورؐ کی عالی نسبی ذاتی حیثیت سے آپ عرب کے ایک شریف ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے حسَب نسَب کو تمام اہل عرب جانتے تھے، اور عرب کے بکثرت قبائل، جن کو اپنے نسب پر فخر تھا، اِس بات سے واقف تھے کہ پدری اور مادری سلسلوں میں کہیں نہ کہیں جا کر اُن کا نسب آپ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ اس لیے آپ کی حیثیت یہ نہ تھی کہ کوئی مجہول النسب، غیر معروف، گمنام، یا کم اصل آدمی یکایک لوگوں کے سامنے ایک بہت بڑے دعوے کے ساتھ آکھڑا ہوا ہو جسے دیکھتے ہی کہنے والے کہہ دیں کہ اس حیثیت کے آدمی پر تو یہ دعویٰ کسی طرح نہیں سجتا۔ پورے عرب میں کوئی شخص آپ کی شرافتِ نسبی پر شمّہ برابر بھی حرف گیری نہ کر سکتا تھا۔ خود شہر مکّہ میں جتنے گھرانے اپنی عزت کے غرور میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، اُن سب سے آپ کی اور آپ کے خاندان کی رشتہ داریاں تھیں۔ اُن میں سے بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ اپنے حسب نسب اور معاشرتی مرتبے میں اُس سے کسی طرح کم تر ہیں۔ قریش، جس کے ایک فرد آپ تھے، عرب میں سرداری کا مقام رکھتا تھا۔

اُس کا اولادِ اسمٰعیل سے ہونا ہر شک و شبہ سے بالا تھا۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر دُور دُور تک اس کے تجارتی روابط پھیلے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کی تولیت اور حج کی کشش کے باعث عرب کے دُور دراز گوشوں تک کے لوگوں کو بہرحال اُس سے سابقہ پیش آتا تھا۔ اِن وجوہ سے اِس قبیلے کو عرب میں وہ بلند مرتبہ حاصل تھا جو کسی دوسرے قبیلے کو حاصل نہ تھا۔ پس مکّے جیسے مرکزی مقام پر، قریش جیسے ایک قبیلے میں پیدا ہونا، عرب کے ماحول میں اِس تحریک کے رہنما کے لیے مثالی موقع و محل تھا۔

آپؐ کا بنی اسماعیل میں سے ہونا اسماعیلی خاندان کی بزرگی و شرافت اور عزت و منزلت کے ساتھ یہ بات بھی خاص اہمیت رکھتی تھی کہ ڈھائی ہزار سال کی پوری تاریخ میں حضرت اسمٰعیل کے بعد اِس خاندان کے کسی فرد نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اِسی بات کی نشاندہی بنی عامر بن صَعْصَعَہ کے ایک جہاندیدہ شیخ نے اُس وقت کی تھی جب اُس کے قبیلے کے لوگوں نے حج سے واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا ذکر اُس سے کیا تھا۔ انھوں نے جب اس کو بتایا کہ قریش کے ایک صاحب ہمیں ملے تھے جنھوں نے نبی کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا اور ہم سے یہ چاہا کہ ہم انھیں اپنے ساتھ اپنے علاقے میں لے چلیں اور اللہ کا پیغام پہنچانے میں ان کی مدد کریں، مگر ہم نے ان کی بات قبول نہ کی، تو اُس مردِ کہن سال نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا "اُس وقت تمھاری عقل کہاں چرنے چلی گئی تھی؟ خدا کی قسم آج تک کسی اسماعیلی نے ایسی بات جھوٹ گھڑ کر کبھی نہیں کہی ہے"۔ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولادِ اسماعیلؑ میں سے ہونے کا ایک اور فائدہ تھا۔ تاریخ یہ شہادت دے رہی تھی کہ آپ کا دعوائے نبوت برحق ہے، کیونکہ اِس خاندان کا کوئی شخص کبھی نبوت کا جھوٹا دعوےٰ لے کر نہیں اُٹھا تھا۔

آپؐ کی شخصیت جہاں تک حضورؐ کی شخصیت کا تعلق تھا، آپ کی شکل و صورت اور وضع و ہیئت اور نشست و برخاست اور رفتار و گفتار اور شائستہ اطوار کو دیکھ کر بچپن ہی سے عرب کے قیافہ شناس یہ کہہ رہے تھے کہ یہ کوئی غیرمعمولی ہستی ہے جو عبدالمطلب کے خاندان میں پیدا ہوئی ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ، آپ کے جدِامجد، آپ کے چچا، آپ کی رضاعی والدہ، سب کے تاثرات تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سنی ہی میں جو لوگ آپ کو قریب سے دیکھ رہے تھے وہ آپ کے اندر ایک نمایاں عظمت محسوس کر رہے تھے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک بالکل اجنبی آدمی بیک نظر آپ کو دیکھ کر پکار اُٹھتا کہ خدا

کی قسم پر کسی جھوٹے انسان کا چہرہ نہیں ہے۔ جب آپؐ جوانی کی عمر کو پہنچے تو آپؐ کی شان ہی کچھ ایسی تھی کہ آپ کے اہلِ وطن اور اہلِ قبیلہ آپ کی شخصیت سے مرعوب ہونے چلے گئے۔ لوگ خود بخود آپ کا احترام کرتے تھے، کیونکہ وہ اپنے معاشرے کی عام سطح سے آپ کو بہت بلند پاتے تھے۔ آپ کی وجاہت، آپ کا وقار، آپ کی سنجیدگی، آپ کی نفاست و پاکیزگی، آپ کی عالی ظرفی، آپ کی کریم النفسی اور آپ کی بے داغ سیرت ایسی نمایاں تھی کہ جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آتا تھا وہ آپ کی تکریم و عزت کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہ رعب اُس وقت بھی کارفرما رہا جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کی وجہ سے قریش کے لوگ آپ کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ دشمنی کے جوش میں پاگل ہو کر بسا اوقات وہ آپ کے ساتھ بڑی بڑی بیہودگیاں کر بیٹھتے تھے، لیکن جس درجے کی دشمنی اُن کے سینوں میں آگ کی طرح بھڑک رہی تھی، اور جس دشمنی کی بنا پر وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں اور قریب ترین خونی رشتہ داروں تک کو اذیت ناک مظالم سے معاف نہیں کر رہے تھے، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص رعب تھا جو آپ کے مقابلے میں آ کر انہیں بے بس کر دیتا تھا۔ آپ نے دعوتِ عام شروع کرنے کے بعد سخت سے سخت حالات میں بھی کھلم کھلا اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ شعبِ ابی طالب میں محصور ہو جانے کے باوجود آپ برابر اُس حصار سے نکل کر دعوت کا کام انجام دیتے رہے۔ مکہ کے آخری تین سال، جو انتہائی سخت تھے، ان میں بھی آپ صرف مکّے میں آنے والوں ہی سے نہیں، عکاظ اور مَجَنّہ اور ذِی المَجَاز اور مِنیٰ کے اجتماعات میں قبائل اور ان کے سرداروں سے بھی علانیہ ملاقاتیں کر کے اسلام کی دعوت پیش کرتے رہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ آپ کی شخصیت میں کوئی ایسی زبردست طاقت تھی جس کی وجہ سے کوئی آپ کو فرائضِ رسالت انجام دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ پچھلے صفحات میں آپ کی نگاہ سے وہ مثالیں گزر چکی ہیں جو بتاتی ہیں کہ آپ کا بدترین دشمن، ابوجہل تک آپ سے کس درجہ مرعوب تھا۔

نبوت سے پہلے کی زندگی

اب دیکھیے کہ نبوت سے پہلے چالیس سال تک آپ کی جو زندگی مکّے میں گزری تھی اُس کے اثرات کیا تھے۔ یہ زندگی صرف بے داغ ہی نہ تھی، بلند ترین سیرت و کردار کا ایک نمونہ تھی جس معاشرے میں آپ بچپن سے ادھیڑ عمر تک رہے بسے تھے، جس کے لوگوں کو ہر پہلو سے آپ کے ساتھ رشتہ داری، ہمسایگی، میل جول، دوستی، لین دین، غرض طرح طرح کے معاملات میں شب و روز سابقہ پیش آتا رہا تھا، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو آپ کی سچائی، آپ کی دیانت، آپ کی شرافت، آپ کی اخلاقی پاکیزگی، آپ کے

حسنِ سلوک، آپؐ کی رحمدلی اور آپؐ کی ہمدردی و فیاضی کا معترف نہ ہو۔ آپؐ مجسّم خیر تھے، کسی کو آپؐ سے شر کا تجربہ تو درکنار، اس کا اندیشہ تک کبھی نہ ہوا تھا۔ آپؐ کے اوپر لوگوں کا اتنا اعتماد تھا کہ وہ آپؐ کو "امین" کہتے تھے، اور یہ اعتماد اس وقت بھی قائم رہا جب اسلام کی دعوت پیش کرنے کی وجہ سے لوگ آپؐ کے دشمن ہو گئے تھے۔ اس حالت میں بھی دوست دشمن، سب اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھواتے رہے، کسی کو آپؐ سے خیانت کا خطرہ نہ تھا، اور آپؐ نے قتل گاہ سے نکلتے وقت بھی ان کی رکھوائی ہوئی امانتیں واپس کرنے کا اہتمام فرما کر اپنا کامل و اکمل امین ہونا قطعی طور پر ثابت کر دیا۔ آپؐ کی صداقت اس معاشرے میں اس درجہ مسلّم تھی کہ جب آپؐ نے اسلام کی دعوت شروع کی اور قریش کے لوگوں نے اس کو پورے زور شور کے ساتھ جھٹلایا، اُس وقت بھی مخالفین آپؐ کو جھوٹا کہنے کی ہمت نہ کر سکے، بلکہ اُس دعوت ہی کو جھوٹ کہتے رہے جو آپؐ نے پیش فرمائی تھی۔ بدترین عداوت کے دور میں بھی کوئی آپؐ کی سیرت و کردار پر کسی ادنیٰ درجے میں بھی حرف زنی نہ کر سکا۔ آپؐ سے قریب ترین تعلق جن لوگوں کا تھا، جن سے کوئی عیب نہ چھپ سکتا تھا (اگر معاذ اللہ وہاں کوئی عیب ہوتا) وہی سب سے بڑھ کر آپؐ کے گرویدہ اور آپؐ کے فضائلِ اخلاق سے متاثر تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے شادی کے لیے قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی درخواستیں ردّ کر دیں، اور خود خواہش کر کے آپؐ سے اسی بنا پر شادی کی کہ وہ آپؐ کی اخلاقی خوبیوں پر فدا ہو گئی تھیں۔ پندرہ برس کی ازدواجی زندگی اس بات کے لیے بالکل کافی ہوتی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے عیب و صواب سے خوب واقف ہو جائے، خصوصاً جب کہ وہ شوہر سے عمر میں بڑی بھی ہو، عاقل و فرزانہ بھی ہو، اور شوہر اسی کے مال سے کاروبار تجارت بھی کر رہا ہو۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اس طویل اور انتہائی قریبی مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ جو کچھ نکلا وہ یہ تھا کہ انہوں نے آپؐ کو محض ایک بلند پایہ انسان ہی نہیں، بلکہ اتنا عالی مرتبہ انسان پایا کہ انہیں آپؐ کو رسولِ رب العالمین مان لینے اور آپؐ پر ایمان لے آنے میں ایک لمحہ بھر بھی تامّل نہ ہوا۔ حالانکہ ایک بناوٹی آدمی کی دنیادار بیوی اس کے مکر اور اس مکر کے فوائد میں چاہے کتنا ہی حصہ لیتی رہے، وہ دل سے نہ کبھی اس کی معتقد ہو سکتی ہے اور نہ اس پر ایمان لا سکتی ہے۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غلامی کی حالت میں شروع ہوا

تھا۔ آقا اور غلام کے درمیان خوشگوار رابطہ بھی ایک نادر الوقوع چیز ہے کجا کہ غلام کو آقا سے محبت ہو، کیونکہ وہ بالکل بے بس ہوتا ہے اور آقا اس سے ہر طرح خدمت لینے کا حق دار ہوتا ہے، خواہ وہ خدمت اُس کے لیے کتنی ہی شاق اور اس کی طبیعت پر کتنی ہی گراں ہو۔ اس کے علاوہ غلام کو آقا کی زندگی کے اچھے اور بُرے سب پہلو دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اور ایک بے اختیار خادم کی حیثیت سے اس کے سامنے اپنے مختارِ مطلق آقا کی زندگی کے بُرے پہلو زیادہ آتے ہیں۔ لیکن حضورؐ ایسے آقا تھے کہ غلام آپؐ کا گرویدہ ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ جب اس کے باپ اور چچا اُسے غلامی سے چھڑانے کے لیے آئے تو اس نے آزاد ہو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ جانے کی بہ نسبت حضورؐ کی غلامی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ۱۵ سال آپؐ کی خدمت میں رہ کر یہ غلام، جسے آپؐ نے آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا، آپؐ کے اخلاق کریمانہ سے اتنا متاثر ہوا کہ جب اُسے آپؐ کے منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے کا علم ہوا تو اس نے بھی حضرت خدیجہؓ کی طرح آپؐ پر ایمان لانے میں ایک لمحہ بھر بھی توقّف نہ کیا۔ وہ کوئی ناسمجھ بچہ نہ تھا بلکہ ۳۰ برس کا جوان تھا اور ایسا ذکی و دانشمند تھا کہ ۸ھ میں وہ اس فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا جس میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت خالدؓ بن ولید جیسے لوگ اس کے ماتحت تھے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ کوئی کم عقل خادم تھا جسے نبوت و رسالت کی اہمیت معلوم نہ تھی اور محض اپنے مخدوم کی شخصیت سے مرعوب ہو کر وہ بے سمجھے بوجھے ایمان لے آیا تھا بلکہ درحقیقت اس نے اپنے پندرہ سال کے طویل تجربے میں آپؐ کو اِتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ اسے آپؐ کے رسولِ خدا ہونے میں ذرہ برابر شک لاحق نہ ہوا۔ حضورؐ کی اِسی اخلاقی فضیلت کو چند سال پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ نہ جانے کی وجہ بتا چکا تھا۔

ایسا ہی معاملہ حضرت ابوبکرؓ کا تھا جو بیس سال سے آپؐ کے ہم نشین ہی نہیں بلکہ گہرے دوست تھے، حضرت علیؓ کا تھا جنھوں نے آپؐ کے گھر ہی میں پرورش پائی تھی، اور وَرَقہ بن نوفل کا تھا جو بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے اور حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے جنھیں آپؐ کو اور زیادہ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ پھر ابتدائی مسلمانوں کو دیکھیے۔ حضرت عثمانؓ آپؐ کی پھوپھی کے نواسے تھے۔ حضرت زبیرؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ آپؐ کے دُودھ شریک بھائی بھی تھے اور پھوپھی زاد بھائی بھی۔ حضرت

جعفرؓ بن ابی طالب آپؐ کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص آپؐ کی والدۂ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آپؐ کی سیرت و کردار کے ہر پہلو کو قریب سے نہ دیکھ چکا ہو، اور یہی لوگ آپؐ کی نبوت کو سب سے پہلے تسلیم کرنے والوں میں سے تھے۔

نبوت کے بعد آپؐ کے اوصافِ عالیہ کا ظہور کسی تحریک کا آغاز ہی اگر ایسی عظیم و جلیل ہستی کی رہنمائی میں ہو تو یہ بجائے خود بہت بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن شروع ہونے کے وقت سے ۱۳ سال تک اس ابتدائی سرمایہ میں جو مزید اضافے ہوئے وہ اتنے قیمتی تھے کہ انسانی تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سب سے پہلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اوصاف کو دیکھیے جو اِس دَور میں نمایاں ہو کر سامنے آئے اور سب سے بڑھ کر اِس دعوت کو فروغ دینے کے موجب بنے۔

آپؐ کا مالی ایثار آپ کا اولین وصف وہ ایثار تھا جو آپ نے اس کارِ عظیم کے لیے کیا۔ آغازِ نبوت کے وقت آپ ایک نہایت کامیاب اور خوش حال تاجر تھے۔ ایک طرف حضرت خدیجہؓ کا مال تھا جو قریش کے دوسرے تاجروں کے مجموعی مال سے کم نہ تھا۔ دوسری طرف آپ کی ذہانت و فراست، حسنِ تدبیر اور راستبازی کی ساکھ تھی، جس کا مقابلہ کوئی دوسرا نہ کر سکتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں جس کاروبار میں یکجا جمع ہو گئی ہوں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیسی زبردست ترقی کر رہا ہو گا۔ لیکن نبوت سے پہلے اس مال کو حضورؐ اور آپ کی شریکِ حیاتؓ نے محض اپنے عیش و آرام کے لیے مخصوص نہیں کر رکھا تھا، بلکہ نہایت دریا دلی کے ساتھ آپ اسے رشتہ داروں سے صلہ رحمی، حاجت مندوں کی مدد، بے کسوں کی دست گیری اور مسافروں کی مہمان نوازی پر خرچ کرتے رہے تھے اور ہر کارِ خیر میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس لیے آغازِ نبوت میں کوئی بہت بڑا اندوختہ آپ کے پاس نہ تھا۔ پھر جب فرائضِ نبوت کا بار آپ پر ڈالا گیا تو رفتہ رفتہ آپ نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دیا، اور آپ کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ تبلیغِ دین کے ساتھ اپنی تجارت بھی چلا سکیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب آپؐ طائف تشریف لے گئے تو آپ کو پیدل ہی جانا پڑا۔ کوئی سواری آپ کو میسر نہ تھی۔ ہجرت کی تو اس کے سارے مصارف حضرت ابوبکرؓ نے برداشت کیے، حتیٰ کہ اہل و عیال کو مدینے بلانے کے لیے بھی آپ کو ۵۰۰ درہم جنابِ صدیقؓ سے لینے پڑے۔ آپ کا دستِ مبارک درہم و دینار سے بالکل خالی تھا۔ ظاہر ہے کہ

جب ایک دعوت کا پیش کرنے والا خود اُس دعوت کے کام پر اپنے ذاتی مفاد کو اس طرح قربان کر رہا ہو، تو ہر دیکھنے والا اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بالکل مخلص اور بے غرض ہے حتیٰ کہ دشمن اور مخالف تک زبانوں سے خواہ کچھ ہی کہتے رہیں، اپنے دلوں میں یہ مان جاتے ہیں کہ اس دعوت کے سامنے اُس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ اور جو لوگ اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کے ساتھ آتے ہیں ان کے لیے ان کے رہنما کی مثال ایسی سبق آموز ہوتی ہے کہ وہ بھی حق کو محض حق ہونے کی بنا پر مانتے ہیں، کسی ذاتی غرض کا لوث ان کے ایمان کے ساتھ لگا ہوا نہیں ہوتا، اور ایثار و قربانی میں بھی وہ اپنے ہادی و رہبر کی پیروی کرتے ہیں۔

آپؐ کا زبردست عزم دوسری چیز آپ کے عزم کی پختگی تھی جسے مشکلات و مصائب اور مخالفتوں کا کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی شکست نہ دے سکا، جسے نہ کوئی خوف اپنی جگہ سے ہٹا سکا، نہ کوئی لالچ پھسلا کر راہ حق سے منحرف کر سکا، اور نہ کسی قسم کے سخت سے سخت حالات مایوسی و دل شکستگی میں تبدیل کر سکے۔ وہ آپ کی پہاڑ جیسی استقامت ہی تھی جس سے ٹکرا کر ساری مخالف طاقتیں آخر کار اس بات سے مایوس ہوگئیں کہ اپنے کسی حربے، کسی مظاہرۂ قوت، کسی ظلم و ستم، کسی تخریص و ترغیب، کسی افترا پردازی اور الزام تراشی کی مہم اور کسی بڑے سے بڑے ہتھکنڈے سے وہ آپؐ کو اُس کام سے باز رکھ سکیں گے جسے لے کر آپ اُٹھے ہیں۔ دیکھنے والے آپ کی اس اولوالعزمی کو سالہا سال تک بالکل بے لچک پا کر یہ اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ جب تک کسی شخص کو اپنے حق پر ہونے کا کامل یقین نہ ہو، اور جب تک کوئی شخص ذاتی اغراض کی کھوٹ سے بالکل پاک نہ ہو، وہ اپنے عزم میں اتنا مضبوط نہیں ہو سکتا۔ اِسی چیز نے آپ کے ساتھیوں میں بھی ایمان کی مضبوطی اور راہ حق میں استقامت پیدا کی، اور اسی نے تمام غیر جانب دار لوگوں کو بھی قائل کر دیا کہ آپؐ جو دعوت پیش کر رہے ہیں وہ خالص حق پرستی پر مبنی ہے۔

آپؐ کی بے نظیر شجاعت تیسری چیز آپ کی بے خوفی اور شجاعت و بہادری تھی جو کسی بڑی سی بڑی طاقت سے دب جانا اور کسی بڑے سے بڑے خطرے سے ڈر جانا جانتی ہی نہ تھی۔ کفارِ قریش کا ایک بپھرا ہوا مجمع آپؐ کو حرم میں تنہا گھیر لیتا ہے اور آپؐ سے کہتا ہے کہ تم وہ ہو جو یہ کہتے ہو، اور تم وہ ہو جو یہ کہتے ہو۔ ان ساری باتوں کے جواب میں آپؐ بے جھجک فرماتے چلے جاتے ہیں کہ ہاں میں یہ کہتا ہوں اور میں یہ بھی کہتا ہوں۔ جان کے دشمن لوگوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پا کر آپ پر ذرا سی گھبراہٹ تک طاری نہیں

ہوتی۔ غارِ ثور کے عین دہانے پر دشمن پہنچ جاتے ہیں، اور آپ پورے اطمینان کے ساتھ اس وقت نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے ہیں کہ یہ ظالم اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈالیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ آپ بڑے ٹھنڈے دل سے، کسی ادنیٰ درجہ کی پریشان خاطری کے بغیر فرماتے ہیں کہ "ابوبکر تمہارا اُن دو آدمیوں کے متعلق کیا خیال ہے جن میں تیسرا اللہ ہو؟ گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" دشمنوں نے آپ کے سرِ مبارک کے لیے انعام مقرر کر رکھا ہے۔ ہر طرف انعام کے لالچ میں آپ کی تلاش کے لیے لوگ دوڑے پھر رہے ہیں۔ اور آپ اطمینان کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سفر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی طرف مڑ کر بھی یہ نہیں دیکھتے کہ کہیں کوئی تعاقب میں تو نہیں چلا آ رہا ہے۔ ایسے بہادر رہنما کے ساتھ بہادر لوگ ہی آتے ہیں، اور اُس کی بہادری دیکھ کر ان کی بہادری میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ دشمن بھی، خواہ دشمنی میں کتنا ہی اندھا ہو چکا ہو، اُس کے اِس وصف کی قدر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی ہمت بیٹھ جاتی ہے جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سابقہ ایک ایسے شخص سے ہے جو ڈر نام کی کسی چیز کو جانتا ہی نہیں۔ کسی تحریک کے لیے، اور خصوصاً اسلامی تحریک کے لیے اس کے رہنما کا نڈر اور بے خوف اور شجاع ہونا ایک بڑا اہم وصف ہے۔ رہنما کی بزدلی، بلکہ اس کی شجاعت میں ذرا سی کمزوری بھی آزمائش کے مواقع پر پوری تحریک کو لے بیٹھتی ہے۔

آپ کی عالی ظرفی چوتھا اہم ترین وصف آپ کا صبر و تحمل، ضبطِ نفس، اور بلند حوصلہ تھا۔ آپ مخالفین کی کسی رکیک سے رکیک حرکت پر بھی کبھی غصے میں آپے سے باہر نہ ہوئے۔ کسی گالی کا جواب آپ نے گالی سے نہ دیا۔ کسی بدزبانی اور کسی بیہودہ الزام کے جواب میں آپ کی زبان مبارک سے ایک لفظ بھی شائستگی سے گرا ہوا نہ نکلا۔ دشمنوں نے بارہا ایسی حرکتیں کیں جو سخت دل آزار، سخت توہین آمیز اور سخت اشتعال انگیز تھیں۔ مگر آپ بڑی عالی ظرفی کے ساتھ ہر بات کو پی گئے، اور ان کی بُرائی کا جواب بُرائی کے بجائے بھلائی ہی سے دیتے رہے۔ مکہ معظمہ کے طویل دَورِ مصائب میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں تہذیب و شرافت کا دامن آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ وہ چیز تھی جو گرد و پیش کے معاشرے میں آپ کا اخلاقی وقار بڑھاتی چلی گئی اور آپ کے مخالفوں کو ہر اُس شخص کی نظر سے گراتی چلی گئی جس کے اندر ذرہ برابر بھی اخلاق و شرافت کا کوئی جوہر موجود تھا۔ طائف سے زیادہ سخت وقت آپ پر کبھی نہ گزرا تھا۔ مگر اُس وقت بھی آپ کے دل اور زبان سے دُعا ہی نکلی اور آپ اِس پر راضی نہ ہوئے کہ اِن ظلم کے بدلے میں ظالموں پر خدا

کا عذاب نازل ہو۔ میدانِ جنگ سے پہلے ہی اخلاق کے میدان میں آپ اپنے مخالفوں کو شکست دے چکے تھے، اور اِس شکست پہ آخری مہر اُس وقت لگ گئی جب قتل گاہ سے نکلتے وقت بھی آپ نے اہلِ مکہ کی امانتیں اُن کو واپس دینے کی فکر فرمائی۔ کوئی بالکل ہی مُردہ ضمیر ہوگا جو اِس کردار کو دیکھ کر اپنے دل میں مان نہ گیا ہو کہ جاہلیت کے حامی اُس شخص سے لڑ رہے ہیں جو اُن کی قوم ہی کا نہیں، ساری دُنیا کا شریف ترین انسان ہے۔ اسلامی تحریک میں شامل ہونے والوں کی اخلاقی تربیت کے لیے بھی ہزار وعظوں سے بڑھ کر اپنے ہادی و رہبر کی یہ عملی مثال مؤثر تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ جس نے بھی آپ کی پیروی اختیار کی وہ اخلاق کے اعتبار سے اپنے معاشرے میں اتنا بلند ہوگیا کہ ہر دیکھنے والا علانیہ بُت پرست اور خدا پرست کے فرق کو دیکھ سکتا تھا۔

پانچواں اور سب سے زیادہ اہم وصف یہ تھا کہ آپ کے قول اور عمل میں کامل مطابقت

پانچواں اور سب سے زیادہ اہم وصف یہ تھا کہ آپ کے قول اور عمل میں برائے نام بھی کوئی تضاد نہ تھا۔ جو کچھ آپ کہتے تھے وہی کرتے بھی تھے۔ جن چیزوں کو آپ نے بُرا کہا اور لوگوں کو ان سے منع کیا، اُن کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔ مکّے کے لوگ آپ کی گھر سے باہر کی زندگی ہی کو نہیں، گھر کے اندر کی زندگی کو بھی دیکھ سکتے تھے، کیونکہ ان میں کتنے ہی لوگ آپؐ کے والد ماجد، یا آپ کی والدۂ ماجدہ، یا آپ کی اہلیۂ محترمہ کے رشتہ دار تھے۔ لیکن کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ آپؐ دوسروں کو جن بُرائیوں سے روکتے ہیں وہ، یا ان میں سے کوئی ایک کم سے کم درجے کی بُرائی بھی آپ کی اپنی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح جن نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف آپ لوگوں کو دعوت دیتے تھے، سب سے بڑھ کر آپ خود اُن پہ عمل پیرا تھے۔ آپ کی زندگی اُن کا مجسّم عملی نمونہ تھی۔ کوئی اِس امر کی کبھی نشاندہی نہ کر سکا کہ آپ سے اُن بھلائیوں پہ عمل کرنے میں کوئی ادنیٰ درجے کی بھی کوتاہی ظاہر ہوئی ہے۔ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے عموماً، اور اسلامی تحریک کے لیے تو خصوصاً یہ بہترین ضمانت ہے کہ اُس کا رہنما قول و عمل کے تضاد سے بالکل پاک ہو، اور اس کی تعلیم محض زبانی جمع خرچ نہ ہو بلکہ اُس کی اپنی عملی زندگی اُس تعلیم کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ اِس کا گہرا اثر لازماً ان لوگوں پہ بھی پڑتا ہے جو ایسے رہنما کی پیروی اختیار کرتے ہیں، اور وہ لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو غیر متعصب نگاہ سے حق کی خاطر اُسے دیکھتے ہیں، حتّٰی کہ متعصب مخالفین میں سے بھی ایک بڑی تعداد بالآخر اس سے مسخّر ہو کر رہتی ہے۔

آپ کا تمام تعصبات سے پاک ہونا چھٹا وصف، جو اپنی اہمیت میں کسی دوسرے وصف سے کم نہیں، یہ تھا کہ آپ ہر تعصب سے پاک تھے۔ قبیلے، قوم، وطن، زبان، رنگ، نسل، غرض کسی چیز کا تعصب بھی آپ کے اندر نہ تھا۔ نہ آپ امیری و غریبی کے لحاظ سے انسان اور انسان کے درمیان فرق کرتے تھے، اور نہ معاشرتی مرتبے کی اونچ نیچ آپ کے لیے کوئی معنی رکھتی تھی۔ آپ انسان کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھتے تھے، اور انسانوں میں سے جو بھی حق کو قبول کر لیتا اسے آپ کی جماعت میں بالکل برابر کا درجہ حاصل ہوتا تھا، خواہ وہ قریشی ہو یا غیر قریشی، خواہ وہ عرب ہو یا حبشی یا رومی، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ غریب ہو یا امیر، خواہ وہ جاہلیت کے معاشرتی نظام کی رو سے "شریف" ہو یا "کمین"۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اسلامی تحریک کے یومِ آغاز ہی سے اس کے ایک عالمگیر تحریک ہونے کی بنا ڈال دی تھی، امتِ مسلمہ کو ایک بین الاقوامی امت کی حیثیت بخش دی تھی، اسلام قبول کرنے والوں کے اندر سے اسلام و کفر کے سوا ہر دوسری بنیاد پر انسان اور انسان کے درمیان امتیاز کا احساس مٹا دیا تھا اور ان کی جماعت میں غلام اور آزاد، غریب اور امیر، برتر اور کمتر، عرب اور غیر عرب، سب بالکل مساوی حیثیت سے شریک تھے، اور شریک ہو سکتے تھے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہوں۔ عرب کے قلیل التعداد متکبروں کو چھوڑ کر باقی عام آبادی کے لیے یہ چیز اپنے اندر ایک فطری کشش رکھتی تھی جو بالآخر کارگر ثابت ہو کر رہی۔

یہ تھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اوصاف جو ۱۳ برس کے مکی دور میں ظاہر ہوئے اور جن کی زبردست قوتِ تاثیر سے دشمنوں کی ساری کوششوں کے علی الرغم اسلامی تحریک آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ مزید اوصافِ عالیہ ابھی آپ کے اندر مخفی تھے اور اپنے ظہور کے لیے دوسرے حالات کے متقاضی تھے جو آگے چل کر اسلامی تحریک کو مدینے میں میسر آئے۔

قرآن کی قوتِ تسخیر اس تحریک کا دوسرا عظیم ترین سرمایہ قرآن مجید تھا جس کا دو تہائی سے کچھ کم حصہ مکۂ معظمہ میں نازل ہوا۔ عرب کے لوگ فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کے عاشق تھے۔ یہی عشق انہیں عکاظ جیسے میلوں میں شعراء اور فصحاء کا کلام سننے کے لیے کھینچ لے جاتا تھا۔ مگر قرآن سن کر اُن کی نگاہ میں بڑے سے بڑے زبان آوروں کی کوئی وقعت باقی نہ رہی۔ شاعر و خطیب اس کے آگے گُنگ ہو گئے۔ ادب کے لحاظ سے اس کی زبان اتنی بلند تھی کہ کوئی اُس سے بلند تر تو درکنار، اس کے برابر بھی اونچے ادب کا تصور نہ کر سکتا تھا۔ اس کا بیان ایسا وجد آور تھا کہ لوگ اس کو سن کر سر دھننے لگتے تھے، مخالفین اُسے

سحر (جادو) کہتے تھے، اور غیر متعصب لوگ پکار اٹھتے تھے کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہو سکتا۔ اس کی شدت تاثیر کا حال یہ تھا کہ حضرت عمر جیسے سخت دشمن اسلام کا دل اس نے پگھلا دیا اور انہیں رسول اکرم کے قدموں میں لا ڈالا۔ قریش کے ایک نامور سردار جبیر بن مُطعِم جنگ بدر کے بعد اسیروں کی رہائی پر بات چیت کرنے کے لیے مدینے گئے۔ وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور اس میں سورۂ طور زیر تلاوت تھی بخاری و مسلم میں ان کا اپنا قول منقول ہوا ہے کہ آیات ۳۵ تا ۴۳ جب حضور پڑھ رہے تھے تو میرا دل سینے سے اُڑا جاتا تھا۔ بعد میں ان کے مسلمان ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس روز یہ آیات سن کر اسلام ان کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اسی لیے دشمن کوشش کرتے تھے کہ لوگ اسے نہ سنیں، مگر خود ان سے رہا نہ جاتا تھا اور چھپ چھپ کر اُسے سنتے تھے۔ اس انتہائی مؤثر کلام کے ذریعے سے شرک اور جاہلیت کے ایک ایک پہلو پر ایسی مدلل تنقید کی گئی کہ کسی معقول آدمی کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ ان عقائد اور رسوم اور اخلاقی برائیوں کے حق میں ایک لفظ بھی کہہ سکتا جن پر قریش اور عرب کے مذہب اور تمدن کی بنا قائم تھی۔ پھر اسی کلام کے ذریعہ سے کمال درجہ دلنشین پیرائے میں اسلام کے عقائد، اس کے اصولِ تہذیب و تمدن اور اس کی اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا جن کی تردید میں کسی بڑے سے بڑے مخالف کے لیے بھی زبان کھولنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اس کے بعد کفار مجبور ہو گئے کہ اسلام کو زک دینے کے لیے مار پیٹ، ظلم و ستم، گالی گلوچ، کذب و افترا اور شور و شغب کے ہتھیاروں سے کام لیں۔ مگر یہ بجائے خود ان کی طرف سے دلیل و حجت اور اخلاق و شرافت کے میدان میں اپنی شکست کا عملی اعتراف تھا۔ ہر وہ شخص جس میں ذرا بھی معقولیت کا شائبہ پایا جاتا تھا، اس معرکے کے دونوں فریقوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتا چلا گیا کہ منکرین و مخالفین کے پاس قرآن کے دلائل اور اس کی پاکیزہ تعلیم کا کوئی جواب اوچھے ہتھکنڈوں اور انسانیت سے گری ہوئی چالوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ کھلا معرکہ صرف مکے ہی میں لوگوں کے سامنے برپا نہ تھا، بلکہ تمام عرب کی نگاہیں بھی اس کو دیکھ رہی تھیں۔ مکے میں تو خیر شب و روز ہی عوام و خواص سب کسی نہ کسی طرح قرآن بھی سن رہے تھے اور ان کارروائیوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو سردارانِ قریش اور ان کے زیر اثر اوباش لوگ قرآن کے جواب میں کر رہے تھے۔ لیکن دس برس تک ہر سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاظ سے منیٰ تک کے اجتماعات میں تشریف لے جا کر عرب کے ہر حصے سے آئے ہوئے لوگوں کو قرآن سناتے رہے، اور ابو جہل اور ابو لہب جیسے لوگ بر سرِ عام آپ کو پتھر مار کر اور آپ پر خاک دھول اڑا کر ان کو یہ بتاتے رہے کہ اس کلام کا جواب

ان کے پاس کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکے میں بھی ساری رکاوٹوں کے باوجود اسلام پھیلتا چلا گیا، اور سرزمین عرب میں بھی کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا جس میں کچھ نہ کچھ لوگ اسلام سے متاثر نہ ہوگئے ہوں۔ مکی دور میں صورت حال یہ تھی کہ علانیہ اسلام قبول کرلینے والے لوگ تو کم تھے، مگر ان سے بیسیوں گنے زیادہ ایسے اشخاص معاشرے میں موجود تھے جن کے دلوں میں قرآن کی تعلیم، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تکریم، اور آپ کے مظلوم ساتھیوں کے لیے ہمدردی، اور قریش کے سراسر بے جا ظلم و ستم کے لیے نفرت جاگزیں نہ ہوگئی ہو۔ اس دور کا یہ کام بھی پوری طرح بارآور ہونے کے لیے ایک مدینے کا طالب تھا جو ٹھیک اپنے وقت پر اس کے لیے آغوش کھول کر سامنے آگیا۔

حضورؐ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف

تیسرا بڑا سرمایہ ایمان لانے والے مسلمانوں کا وہ چیدہ گروہ تھا جو اس تحریک کو ۱۳ سال کے دوران میں میسر آیا۔ یہ وہ صاف دماغ اور سلجھے ہوئے ذہن کے لوگ تھے جنہوں نے شرک و جاہلیت کے اس تاریک ماحول میں پرورش پانے کے باوجود قرآن مجید کی تعلیمات سن کر اپنے دینِ آبائی کا غلط اور دینِ اسلام کا برحق ہونا تسلیم کرلیا اور کوئی تعصب انہیں ایمان لانے سے نہ روک سکا۔ ان کو معلوم تھا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلے اور اپنے شہر کے عام لوگوں کی رائے کے خلاف اسلام قبول کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے کے کیا معنی ہیں۔ ایمان لانے والوں پر جو عذاب توڑے جارہے تھے وہ سب ان کی آنکھوں کے سامنے تھے، مگر وہ اس دل گردے کے لوگ تھے کہ کوئی خوف انہیں باطل کو رد اور حق کو قبول کرنے سے نہ روک سکا۔ انہوں نے ہر طرح کے ظلم صرف اس لیے سہے کہ جس چیز کو وہ باطل سمجھ چکے تھے اس کی پیروی کرنا انہیں کسی حال میں گوارا نہ تھا، اور جس چیز کا حق ہونا انہیں معلوم ہوچکا تھا اسے چھوڑنے کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ انہیں بری طرح مارا پیٹا گیا۔ انہیں الٹا لٹکایا گیا۔ انہیں بھوک پیاس کی مار دی گئی۔ انہیں باندھ کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ ان کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا۔ انہیں تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ ان کے تجارت پیشہ یا صنعت پیشہ لوگوں کا کاروبار بٹھا دیا گیا۔ ان کے بڑے بڑے باعزت لوگوں کو برسرِعام ذلیل کیا گیا۔ مگر یہ سب کچھ انہوں نے محض حق کی خاطر برداشت کرلیا اور ان میں سے کسی ایک مرد یا عورت کو بھی ایمان سے کفر کی طرف نہ پھیرا جاسکا۔ انہوں نے اپنا ایمان بچانے کے لیے دو دفعہ حبش کی طرف اور آخر میں مدینے کی طرف ہجرت کی، گھربار، مال اسباب، عزیز رشتہ دار، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خدا کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے بکثرت ایسے تھے جو تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ لے جاسکے۔ ان کے اس طرزِ عمل نے

ثابت کر دیا کہ اسلامی تحریک کو وہ انتہائی مخلص و جان نثار فدائی مل گئے ہیں، جو اگرچہ مٹھی بھر ہیں، مگر ایسے بہادر ہیں کہ اپنے دین کے لیے ہر قربانی دے سکتے ہیں، ہر مصیبت جھیل سکتے ہیں، ہر تکلیف و اذیت برداشت کر سکتے ہیں، اور ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا سکتے ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ ایسا عظیم اخلاقی انقلاب قرآنِ کریم کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی تربیت سے ان کی زندگی میں رونما ہو گیا کہ اپنی راستبازی و دیانت، اپنی پرہیزگاری و طہارت، اپنی خدا ترسی و خدا پرستی، اپنی عفّت و پاکدامنی، اپنی شرافت و شائستگی اور اپنی مضبوط اور قابلِ اعتماد سیرت کے اعتبار سے صرف عرب ہی میں نہیں، دنیا بھر میں ان کا جواب نہ پایا جاتا تھا۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس معاشرے میں ایک منارۂ نور کی طرح نمایاں تھے اسی طرح آپ کے ساتھیوں کی زندگی کا اخلاقی انقلاب بھی اس قدر ظاہر و باہر تھا کہ ہر دیکھنے والی آنکھ کفار کی اور ان کی اخلاقی حالت کا فرق علانیہ دیکھ سکتی تھی۔ تعصب اور عناد کی بنیاد پر مخالفین زبان سے اس کا انکار کر سکتے تھے، مگر ان کے دل جانتے تھے کہ قدیم جاہلیت کیا سیرت و کردار پیدا کرتی تھی، اور یہ نیا دین کس سیرت و کردار کے انسان تیار کر رہا ہے۔

انصارِ مدینہ کے اوصاف چوتھا عظیم اور بیش قیمت سرمایہ جو مکّی دَور کے آخری تین سالوں میں اسلامی تحریک کو ملا وہ مدینے کے انصار کا خلوصِ ایمانی تھا۔ ان لوگوں کو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت و تربیت میسّر آئی تھی، نہ آپ کی اور آپ کے صحابہ کی پاکیزہ زندگیوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، نہ قرآن پاک کا اُتنا علم حاصل ہوا تھا جو مکّے کے اہلِ ایمان کو حاصل تھا، لیکن یہ ایسے سلیم الطبع اور صحیح الدّماغ لوگ تھے جو حق کی ایک جھلک دیکھتے ہی اس پر فدا ہو گئے۔ صدیوں کی رچی بسی مشرکانہ جاہلیت کو انہوں نے اسلام کی صراطِ مستقیم کا نشان پاتے ہی اپنے دل و دماغ سے گرد کی طرح جھٹک کر نکال پھینکا۔ وہ پکّے پھلوں کی طرح اسلام کی جھولی میں یوں جھڑتے چلے گئے کہ ۱۳ سال کے اندر مکّے میں جتنے لوگ ایمان لائے تھے، تین سال میں ان سے بہت زیادہ مردوں اور عورتوں اور جوانوں اور بوڑھوں نے مدینے میں ایمان قبول کر لیا۔ انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ ایسے خلوص کے ساتھ ایمان لائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اور آپ کے ساتھی تمام اہلِ ایمان کو انہوں نے اپنے ہاں ہجرت کر آنے کی دعوت دے دی، حالانکہ یہ دعوت دیتے وقت وہ خوب جانتے تھے کہ اس کے نتیجے میں انہیں تمام عرب کی دشمنی مول لینی ہوگی، جیسا کہ آخری بیعتِ عقبہ کے موقع پر اُن کی تقریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ انہوں نے حضورؐ

اور آپ کے مکی صحابہ کے لیے اپنے شہر کو دارالہجرت کے طور پر پیش کر دیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انہوں نے پوری خوش دلی اور رضامندی سے آپ کو اپنا حاکم و فرمانروا تسلیم کیا، آپ کی وفادار رعیت اور جاں نثار فوج بن گئے، آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں کو اپنے شہر میں اپنے ساتھ برابر کے حقوق دیے اور اپنے گھر، اپنے مال اور اپنی جائدادوں تک کو ان کے لیے پیش کر دیا۔

اسی چیز نے تاریخ کا رُخ بدل ڈالا۔ اسلام کو ایک دعوت اور تحریک کے مقام سے اُٹھا کر ایک معاشرے اور ریاست کی حیثیت دے دی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ موقع بہم پہنچا دیا کہ آپ ایک آزاد و خود مختار دارالاسلام میں اسلام کے ایک ایک پہلو کو عملی جامہ پہنا کر ساری دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا بھیجا ہوا یہ دین کیسے افراد تیار کرتا ہے، کیسا معاشرہ بناتا ہے، کس قسم کی تہذیب اور کس طرح کا تمدن پیدا کرتا ہے، کیسی اخلاقی روح پورے معاشرے میں جاری و ساری کر دیتا ہے، معیشت، معاشرت، تعلیم، سیاست، قانون اور عدالت کا کیسا نظام قائم کرتا ہے، جنگ میں اس کی تہذیب کیا ہے، فتح پا کر وہ مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے، معاہدے کر کے وہ ان کی کیسی پابندی کرتا ہے، اور بین الاقوامی تعلقات میں اس کا رَویّہ کیا ہے۔ اس نمونے کے خدوخال کیا تھے، اور اس کو عملاً پیش کرنے سے کیا نتائج برآمد ہوئے، یہ ہماری تیسری جلد کا موضوع بحث ہے۔

یہاں پہنچ کر مکی دَور کا بیان ختم ہو گیا ہے۔ آگے مدنی دَور کے لیے مجھے بہت زیادہ تیاری کرنی پڑ رہی ہے۔ ابھی اسے لکھنا شروع نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے کچھ مدت تک ان صفحات میں سیرت سرورِ عالم کی اشاعت کا سلسلہ بند رہے گا۔ دُعا کرتا ہوں، اور قارئین ترجمان القرآن سے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق اور قوت عطا فرمائے اور اپنی ہدایت و رہنمائی سے نوازے۔

ابوالاعلیٰ

جرابوں پر مسح

جناب ملک غلام علی صاحب

بعض احباب نے اُس فتوے کی جانب مجھے متوجہ کیا ہے جو ماہنامہ "البلاغ" کراچی، جمادی الاُولیٰ ۱۳۹۶ھ میں جناب محمد تقی صاحب کے قلم سے "مروجہ موزوں پر مسح" کے زیرعنوان شائع ہوا ہے اور مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ اس میں مولانا مودودی کے ایک جواب مندرجہ "رسائل ومسائل" حصہ دوم کو جس طرح تنقید اور طعن و تشنیع کا ہدف بنایا گیا ہے اس کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ترجمان کے صفحات میں اس "فتوے" پر تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"مروجہ موزوں پر مسح" کے موضوع پر جو کچھ مدیر "البلاغ" نے لکھ کر چھاپ دیا ہے اس میں اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ ہر طرح کی جرابوں پر مسح فقہ حنفی یا کسی دوسرے خاص فقہی مسلک کے مطابق جائز نہیں ہے اور قولِ جواز کو ردّ کرتے ہوئے وہ اپنی تحقیق یا احناف کے اقوال نقل کر دیتے تو ان کا مقصد حاصل ہو جاتا اور ہمیں بھی اس سے تعرض کرنے کی حاجت نہیں تھی۔ لیکن جناب محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر اکتفا کرنے کے بجائے یہ ثابت کرنا بھی ضروری سمجھا ہے کہ "اس مسئلے میں سید ابوالاعلیٰ صاحب نے جمہور اُمت سے الگ راستہ اختیار کیا ہے" اور ساتھ ہی یہ الزام بھی عاید کیا ہے کہ "یہ اُن بہت سے مسائل میں سے ایک ہے جن میں جناب مودودی صاحب کی راہ جمہور سے الگ ہے۔ اگرچہ علامہ ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم کی رائے بھی ذہنی ہے جو مودودی صاحب کی ہے مگر یہ ایک سنگین جسارت ہے۔"

"مسئلے کی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھانے کے لیے" سب سے پہلے عثمانی صاحب نے ایک فقہی قاعدہ بیان کیا ہے کہ کسی حدیثِ متواتر کی موجودگی کے بغیر کسی قرآنی حکم میں کوئی تقیید درست نہیں اور اخبار آحاد سے قرآن کریم کا نسخ، اس کی تقیید یا اس پر زیادتی جائز نہیں۔ عثمانی صاحب نے جس طرح مسح علی الجوربین کے

عدم جواز پر اجماعِ اُمت کا دعوےٰ کیا ہے اُسی طرح اُنہوں نے مذکورہ فقہی اصول بھی اِس طرح بیان کردیا ہے گویا کہ وہ کتاب و سنت کی کوئی نص ہے یا اس پر بھی اجماعِ اُمت ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس قاعدے کو صرف حنفی فقہاء نے اپنایا ہے اور انہوں نے بھی اسے جس شدّ و مدّ کے ساتھ اپنی کتب اصول میں ثبت کیا ہے اپنے اجتہادات و تفریعات میں انہوں نے اُس شدت و شان سے اس کی پابندی نہیں کی بے شمار مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں حضراتِ حنفیہ نے خبرِ واحد (جس کی سند صحیح یا حسن اور بعض اوقات ضعیف ہے) اور قولِ صحابی کو اِس طرح اپنے استنباط کی بنیاد بنایا ہے کہ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بھی قرآن کے فلاں عام حکم کی تقیید و تخصیص ہے۔ جہاں تک دوسرے فقہاء و محدثین کا تعلق ہے وہ حنفیہ کے اِس قاعدۂ مذکور کو علی الاطلاق صحیح نہیں سمجھتے، نہ اسے حدیث کے ردّ و قبول کے لیے معیار بناتے ہیں۔ فقہائے حنفیہ نے جہاں اپنا یہ اصول بیان فرمایا ہے بالعموم وہیں یہ واضح کر دیا ہے کہ شافعیہ اور دیگر فقہاء کو اس سے اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر نور الانوار میں نسخ کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں:

"قرآنی حکم کے عموم کو جب مقید کیا جاتا ہے یا نصِ قرآنی سے زائد حکم حدیث میں وارد ہوتا ہے تو ہم اسے نسخ کہتے ہیں اور شافعی رحمہ اللہ اسے تخصیص و توضیح کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تقیید و تخصیص صرف متواتر و مشہور حدیث کی بنا پر جائز ہے لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک یہ خبرِ واحد کے ذریعے سے بھی جائز ہے۔" (نور الانوار صفحہ ۲۱۲ مطبعہ مصطفائی ۱۳۰۵ھ)

امام شافعیؒ نے اپنے اصولِ فقہ پر جو کتابچہ "الرسالہ" کے عنوان سے تحریر کیا ہے اس میں بھی الناسخ والمنسوخ کی بحث میں انہوں نے اخبارِ آحاد کی مثالیں دی ہیں جن سے قرآنی حکم کے عموم میں تخصیص و تحدید کی گئی ہے حالانکہ اُن کی سند متصل نہیں اور بعض راوی بھی مجہول ہیں۔ مثلاً لا وصیۃ لوارث (وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں) کی سند ملاحظہ ہو:

اخبرنا سفیان عن سلیمان الاحول عن مجاهد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لا وصیة لوارث۔

اس روایت کو حنفیہ نے بھی اُسی طرح اپنا ماخذِ اجتہاد و تشریع بنایا ہے جس طرح دوسروں نے بنایا ہے۔ اسی پر کیا موقوف ہے، قاتل کا مقتول کے ورثے سے محروم ہونا، سونے کا نصاب بیس ۲۰ مثقال ہونا، والدین پر قتل اولاد کا قصاص نہ ہونا، غرض اس طرح کے متعدد مسائل ایسے ہیں کہ جن روایات سے یہ مستنبط ہیں وہ سب

کی سب نہ صرف خبرِ واحد کی تعریف میں آتی ہیں، بلکہ محدثانہ معیار کے مطابق ان کی سند بھی قوی نہیں۔ مگر جملہ فقہاء و محدثین (بشمولِ احناف) نے اس طرح کی روایات کو اپنے مسائل کا ماخذ و مبنیٰ بنایا ہے، حالانکہ حنفیہ کے بیان کردہ قاعدے کے مطابق ان سے قرآن مجید کے عام حکم کی تخصیص ہوتی ہے۔ ان احادیث کو معمول بہ بنانے کے بعد اس امر کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ فقہاء ان پر انحصار کی کیا توجیہ و تاویل بیان فرماتے ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ جو احکام ان سے ماخوذ ہیں، وہ نص قرآنی سے دلالۃً بھی ثابت ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ روایات گو آحاد ہیں، تاہم ایک زمانے میں آکر یہ مشہور و مستفیض ہو گئیں یا انہیں امت کی تلقی بالقبول حاصل ہو گئی، اس لیے اب ان سے قرآنی حکم کی تقیید اور احکامِ فقہ کی تفریع جائز ہو گئی۔ مگر اس پر بھی یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جس عہد میں مذاہب فقہیہ کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی، اور جب ان مرسل و منقطع روایات کو شہرت و استفاضہ کا درجہ نہیں ملا تھا کیا اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے یہ امر ناجائز و ممنوع تھا کہ وہ انہیں احکام کی بنیاد بناتے؟ اگر ایسا تھا تو ان احادیث کو علمائے امت میں عام مقبولیت کیسے حاصل ہو گئی۔

حنفیہ نے نسخ القرآن بالسنۃ کے معاملے میں اپنا خاص نظریہ بیان کرنے کو تو کر دیا ہے مگر عمل کی دنیا میں ہر قدم پر اس کی پابندی سختی سے نہیں کی گئی اور اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ احناف کے اس قاعدہ کلیہ سے نہ صرف شافعیہ بلکہ دوسرے ائمہ کو بھی اختلاف ہے۔ فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت میں نسخ و تخصیص پر کلام کرتے ہوئے مولانا محب اللہ فرماتے ہیں کہ "حنفیہ کے نزدیک کتاب اللہ کی تخصیص خبرِ واحد سے جائز نہیں، اسی طرح سنّتِ متواترہ کی تخصیص بھی خبرِ واحد سے جائز نہیں جب تک کہ تخصیص کے حق میں دلالت و ثبوت کے لحاظ سے کوئی پیشگی قطعی نص موجود نہ ہو۔" پھر فرماتے ہیں:

واجاز الباقون من علماء الاصول مطلقاً سواء خُصّ بقطعی قبله ام لا

(باقی علمائے اصول نے خبرِ واحد کے ذریعہ سے قرآنی حکم کی تخصیص مطلقاً جائز قرار دی ہے خواہ اس تخصیص کے لیے پہلے سے قطعی نص موجود ہو یا نہ ہو)۔ المطبعۃ الامیریۃ، مع المستصفٰی، ج ۲، ص ۳۴۹۔

کسی صاحب کو اگر اصولِ فقہ پر کوئی کتاب یا مضمون لکھنا ہو تو وہ اس میں جس قدر چاہیں دادِ تحقیق دے سکتے ہیں اور حضراتِ حنفیہ کے اس منفرد قاعدے کی تشریح و تائید کر سکتے ہیں۔ لیکن محض جرابوں پر مسح کے سلسلے میں کسی فرد کی رائے کو رد کرنے کے لیے اتنی تمہید باندھنا اور یہ کہنا کہ چمڑے کے موزوں پر مسح کے حق

ہیں بھی اگر دو تین ہی حدیثیں ہوتیں، تب بھی ان کی بنا پر قرآن مجید کے حکم میں کوئی تقیید درست نہ ہوتی کیونکہ اخبارِ آحاد سے قرآن پر زیادتی جائز نہیں ہوتی یا قرآن کا نسخ جائز نہیں ہوتا۔ دینی مسائل کی تفہیم و تبیین کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ عربی مدارس کے طلبہ و اساتذہ ممکن ہے کہ اس سے مستفید و لطف اندوز ہوں لیکن ایک عام قاری یہ پڑھ کر الجھن اور وحشت ہی میں مبتلا ہوگا کہ دو تین حدیثوں سے تو قرآن منسوخ نہیں ہوتا، نہ اس پر زیادتی جائز ہوتی ہے مگر بہت ساری حدیثیں مل جائیں تو ان کے بل پر یہ زیادتی جائز ہو جاتی ہے۔ کاش کہ لفظ "زیادتی" کے بجائے ایزادی، اضافہ یا زیادت جیسے الفاظ ہی استعمال کیے جاتے۔ خبرِ واحد اور اخبارِ آحاد کی اصطلاحات بھی ہر شخص بآسانی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ عثمانی صاحب نے خود بتایا ہے کہ ان کا مفہوم ان کے اپنے ذہن میں کیا ہے؟ خبرِ واحد کا اطلاق ہر اُس حدیث پر ہوتا ہے جو غیر متواتر ہو، خواہ اس کی سند صحیح ہو اور وہ دو تین نہیں بلکہ اس سے زائد سندوں اور طریقوں سے کیوں نہ مروی ہو۔ اور متواتر حدیث وہ ہے جسے ہر مرحلے اور ہر زمانے میں اتنے کثیر التعداد راویوں نے نقل کیا ہو جن کے متعلق عادتاً اور فطری اعتبار سے یہ تصور کرنا محال ہو کہ انہوں نے جھوٹی یا غلط روایت بیان کرنے پر اتفاق اور ایکا کر لیا ہوگا۔ نیز حدیث کا مضمون کسی محسوس و مسموع اور قابلِ مشاہدہ امر پر مشتمل ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو صحاح بلکہ صحیحین کی اکثر و بیشتر احادیث جو احکامِ شریعت سے متعلق ہیں اور عبادات و معاملات کی جزئیات و تفصیلات متعین کرتی ہیں وہ سب غیر متواتر اخبارِ آحاد ہیں، اُن پر پوری اُمتِ مسلمہ کے عمل اور ترک و اختیار کا مدار ہے اور اُن کی اکثریت کے بارے میں بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے "قرآن کریم پر زیادتی یا نسخ یا تقیید لازم آتا ہے۔" ان میں سے ہر حدیث ایسی ہے جس میں قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف یا زائد بات بیان فرمائی گئی ہے، خواہ وہ قرآن کی تشریح ہو یا تخصیص ہو یا علمائے اصول کے ہاں کسی دوسرے نام سے معروف ہو۔ آخر احادیث میں قرآنی آیات تو نہیں دہرائی گئیں۔ اگر ان ساری احادیث پر عمل جائز نہ ہو تو ہمارے پاس گنتی کی کتنی احادیث متواترہ باقی رہ جاتی ہیں جن کی تعمیل و اتباع یا جائز ہوگی؟

بہر کیف دو تین احادیث نہیں، اگر صرف ایک ایک صحیح الاسناد حدیث بھی موزوں پر مسح یا جرابوں پر مسح کے جواز میں وارد ہو، اور کوئی دوسری حدیث خُفّین یا جوربین پر مسح کو ممنوع قرار نہ دیتی ہو تو میرے نزدیک جس طرح خُف پر مسح جائز ہے اُسی طرح جُراب پر بھی جائز ہے۔ مدیر "البلاغ" نے لکھا

ہے کہ جن روایات میں جرابوں پر مسح کا ذکر ہے، وہ کل تین حدیثیں ہیں اور تینوں ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت بلالؓ سے، ایک حضرت ابوموسیٰؓ سے اور ایک حضرت مغیرہؓ سے مروی ہے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کردہ حدیثوں کے بارے میں عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ حافظ زیلعی نے دونوں کے بارے میں ثابت کیا ہے کہ دونوں سنداً ضعیف ہیں۔ اب امام زیلعی نے جو کچھ نصب الرایہ میں فرمایا ہے، وہ بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ لکھتے ہیں:

اما حدیث بلال فرواہ الطبرانی فی معجمہ من طریق بن ابی شیبہ ثنا ابومعاویہ عن الاعمش عن الحکم عن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن کعب بن عجرہ عن بلال قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمسح علی الخفین والجوربین واخرجہ ایضاً عن یزید بن ابی زیاد وابن ابی لیلیٰ عن کعب بن عجرۃ عن بلال قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... نحوہ

معلوم ہوا کہ حضرت بلالؓ سے یہ حدیث دو سندوں کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چمڑے کے موزوں پر بھی اور جرابوں پر بھی مسح فرمایا کرتے تھے۔ یہاں خفین اور جوربین کے الفاظ دونوں صراحت سے مذکور ہیں اور دونوں کے درمیان مغایرت کا عطف ہے، دونوں کا ذکر علی الاطلاق ہے، ساتھ ہی کوئی صفت بیان نہیں کی گئی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہر طرح کے چمڑے کے موزے اور جراب پر مسح ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ان حدیثوں کی سند کا تعلق ہے، پہلی حدیث کی سند پر حافظ زیلعی نے قطعاً کوئی کلام نہیں کیا، صرف دوسری حدیث کے دو راویوں کے متعلق لکھا ہے:

یزید بن ابی زیاد وابن ابی لیلیٰ مستضعفان مع نسبتھما الی الصدق، واللہ اعلم

(یزید بن ابی زیاد اور ابن ابی لیلیٰ کو ضعیف خیال کیا جاتا ہے اگرچہ ان کی نسبت صدق ہی جانب ہے، یعنی وہ جھوٹے یا غلط بیانی کرنے والے نہیں ہیں)۔

یزید بن ابی زیاد کے نام کے کئی راوی ہیں، اس لیے جلدی میں ان کے متعلق تحقیق مشکل ہے لیکن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کو محدثین کی اکثریت نے ثقہ قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے بھی تقریب میں انھیں ثقہ لکھا ہے،

خود حافظ زیلعی نے دونوں راویوں کے متعلق محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے ساتھ لکھ دیا ہے کہ وہ صدوق شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اپنی دوسری تصنیف "تخریج احادیث المہذب" میں پوری سند کے راویوں کو ثقات لکھا ہے جس سے واضح ہو گیا کہ عثمانی صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت بلالؓ والی حدیث بالکل ضعیف اور خارج از بحث ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کردہ حدیث کو لیجیے۔ اس کے متعلق بھی "البلاغ" کے مدیر بس یہ لکھ کر فارغ ہو گئے ہیں کہ حافظ زیلعی نے اس کی سند کو ضعیف لکھا ہے اور امام ابوداؤد نے بھی فرمایا ہے کہ اس کی سند متصل اور قوی نہیں ہے۔ مگر اس حدیث کے متصل یا قوی نہ ہونے کی کوئی تفصیل امام ابوداؤد نے بیان نہیں فرمائی۔ دوسرے محدثین نے اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند میں ضحاک کا سماع حضرت ابوموسیٰؓ سے ثابت نہیں اور عیسیٰ بن سنان ضعیف راوی ہیں۔ مگر یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ ضحاک کا حضرت ابوموسیٰؓ سے حدیث سننا حافظ ابن حجر کے نزدیک ثابت ہے۔ تہذیب التہذیب میں وہ ضحاک بن عبدالرحمٰن کے حالات میں لکھتے ہیں:

روی عن ابیہ وابی موسی الاشعری...... تابعی ثقۃ (ضحاک نے اپنے والد اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے اور وہ ایک ثقہ تابعی ہیں)۔

حافظ علاؤالدین ماردینی جو مشہور حنفی محقق ہیں وہ اپنی کتاب الجوہر النقی میں مسح کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کے راوی ضحاک کا سماع حضرت ابوموسیٰؓ سے ثابت کرنے کے لیے الکمال سے حافظ عبدالکمال کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

سمع ضحاک من ابی موسیٰ (ضحاک نے حضرت ابوموسیٰؓ سے حدیث سماعت کی ہے)۔

جہاں تک دوسرے راوی عیسیٰ بن سنان کا تعلق ہے اسے اگرچہ بعض محدثین نے لین الحدیث کہا ہے مگر صدوق (سچا) بھی قرار دیا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقات میں شمار کیا ہے۔ صحیح بخاری میں اس سے روایت لی گئی ہے۔ امام ماردینی نے بھی مذکورہ بالا مقام پر اس کا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت سننا ثابت کیا ہے۔ امام ذہبی المیزان میں کہتے ہیں کہ بعض نے اس راوی کو قوی شمار کیا ہے۔ پھر حضرت ابوموسیٰؓ کے علاوہ حضرت مغیرہؓ سے بھی اسی مضمون کی روایت سنن ابی داؤد میں موجود ہے جس پر ابوداؤد نے کوئی جرح نہیں کی۔ اور حضرت ابوموسیٰؓ سے یہ روایت سنن ابن ماجہ، معجم طبرانی اور امام طحاوی کی شرح الآثار

میں بھی موجود ہے، اس لیے اس کا درجہ حسن سے کسی طرح کم نہیں ہے اور اس میں ضعف کا پہلو متعدد محدثین کے نزدیک موجود نہیں۔

حضرت بلالؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی حدیث کو رد کرنے اور خارج از بحث قرار دینے کے بعد عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ "اب صرف حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی حدیث رہ جاتی ہے اور اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اگرچہ امام ترمذی نے اس کو "حسن صحیح" کہہ دیا ہے لیکن دوسرے جلیل القدر محدثین نے امام ترمذی کے قول پر سخت تنقید کی ہے"۔ اس پر تو ان شاء اللہ آگے چل کر بحث ہوگی کہ اب صرف یہی ایک حدیث رہ جاتی ہے یا اور بھی احادیث موجود ہیں جو مسح علی الجوربین کا جواز ثابت کرتی ہیں۔ لیکن بفرض محال مزید کوئی ایسی حدیث نہ ہو تب بھی عثمانی صاحب کا یہ موقف کتنا عجیب و غریب ہے کہ سنن ابی داؤد میں باب المسح علی الجوربین میں سب سے پہلے حضرت مغیرہؓ کی جس حدیث کی باقاعدہ تخریج کی گئی ہے اس کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ اس پر خود امام ابوداؤد نے کوئی جرح نہیں کی بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ: مسح علی الجوربین علی بن ابی طالب و ابن مسعود و البراء بن عازب و انس بن مالک و ابو امامۃ و سہل بن سعد و عمرو بن حریث وروی ذالک عن عمر بن الخطاب و ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ گویا کہ امام ابوداؤد کی تصریح کے مطابق ان نو صحابہؓ کرام نے جرابوں پر مسح فرمایا ہے۔ یہ ساری تفصیل تو عثمانی صاحب نے گول کر دی ہے، البتہ امام ابوداؤد کا صرف یہ قول نقل کر دیا کہ عبدالرحمٰن بن مہدی یہ حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت مغیرہؓ سے معروف روایتیں مسح علی الخفین کی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت ابن مہدی کو اگر کسی روایت کے بیان کرنے میں تامل ہو تو مجرد اس بنا پر وہ سب کے ہاں کیسے مردود ہو جائے گی جب کہ دوسرے محدث اور ثقہ راوی اسی مضمون کی احادیث روایت کر رہے ہیں جو جرابوں پر مسح کا جواز ثابت کر رہی ہیں۔

پورے ذخیرۂ احادیث میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں یہ بیان ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ چمڑے کے موزے ہی پر مسح فرمایا ہے اور غیر چرمی موزے یا جراب پر کبھی مسح نہیں فرمایا۔ پھر کوئی قولی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں آنحضورؐ نے یہ فرمایا ہو کہ صرف چمڑے کے موزے ہی پر مسح جائز ہے، جراب پر جائز نہیں ہے، یا صرف ایسی جراب پر جائز ہے جس میں یہ اور یہ شرطیں موجود ہوں اور "جن سے جراب اپنی خصوصیات و اوصاف میں چمڑے کے ہم پایہ ہو گئی ہو"۔ اگر حضرت مغیرہؓ سے

چند احادیث موزوں پر مسح کی ہوں اور ایک ہی حدیث جرابوں پر مسح کی مروی ہو تو دونوں قسم کی احادیث میں ہرگز کوئی تخالف و تعارض لازم نہیں آتا۔ تعارض صرف اس صورت میں واقع ہوتا جب یہ دو قسم کی روایت ایک ہی سفر اور ایک ہی نماز سے متعلق ہوتی اور ایک روایت میں چرمی موزے اور دوسری میں جراب کا ذکر ہوتا۔ جس طرح کسوف و خسوف اور استسقاء کی نمازوں سے متعلق احادیث میں ہیئت، دعا، رکوع و سجود وغیرہ کی تفصیلات کو تعدد واقعات پر محمول کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے اسی طرح حضرت مغیرہؓ اور دوسرے صحابہ کرام کی مرویات جو موزوں اور جرابوں پر مسح سے متعلق ہیں انھیں کیوں الگ الگ واقعات شمار نہیں کیا جا سکتا، حالانکہ سورج گرہن اور چاند گرہن کا واقعہ سفر اور پاؤں پر مسح سے زیادہ نادر الوقوع ہے۔

عثمانی صاحب حضرت مغیرہؓ کی حدیث مسح علی الجوربین کے متعلق مزید لکھتے ہیں کہ متعدد محدثین نے اس حدیث کو ابوقیس اور ہزیل بن شرجبیل دونوں راویوں کے ضعف کی بنا پر ضعیف قرار دیا ہے۔ اس اعتراض کا وہ جواب بالکل کافی و شافی ہے جو حافظ علاؤ الدین ماردینی نے "الجوہر النقی" میں دیا ہے۔ یہ حنفی فقیہ و محدث ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ حضرت مغیرہؓ سے روایت کردہ جرابوں پر مسح والی حدیث کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

> اس حدیث کی ابوداؤد نے تخریج کی ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ ابن حبان نے اسے صحیح اور ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ ابوقیس جن کا نام عبدالرحمٰن بن ثروان ہے انہیں ابن معین نے ثقہ قرار دیا ہے اور العجلی نے بھی اس کی توثیق و تثبیت کی ہے۔ ہزیل کو بھی عجلی نے ثقہ لکھا ہے اور ان دونوں راویوں سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ پھر ان دونوں نے دوسرے راویوں کے مخالف و معارض روایت نقل نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک مستقل سند اور الگ طریق سے زاید بات کی روایت کی ہے جس کا تعارض دوسری احادیث سے نہیں ہے۔ ان دونوں روایتوں کو (یعنی اس روایت کو جس میں جراب کا ذکر نہیں اور جس میں ہے) الگ الگ حدیث شمار کیا جائے گا۔ اس سبب یہ حدیث مسح علی الجوربین صحیح ہے جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا۔

حافظ ابن حجر نے تقریب میں ابوقیس عبدالرحمٰن بن ثروان کو صدوق اور ہزیل بن شرجبیل کو ثقہ تحریر

کیا ہے۔ تہذیب التہذیب میں ہزیل کے متعلق جتنے بھی محدثین کے اقوال درج ہیں، ان سب نے اس راوی کو بلا استثنا ثقہ قرار دیا ہے اور کسی ایک نے بھی جرح کا کوئی کلمہ استعمال نہیں کیا۔ اس کے بعد ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ عثمانی صاحب کی یہ بات کس حد تک وزن اور صداقت کی حامل ہے کہ یہ راوی ضعیف ہیں (عثمانی صاحب کو نصب الرایہ میں جو کچھ اپنے مطلب کا نظر آسکا، وہ تو انہوں نے درج کر دیا ہے لیکن نصب الرایہ کے مصنف امام زیلعی نے اپنے شیخ تقی الدین اسکندری کی جو رائے خاتمۂ کلام کے طور پر نقل کی ہے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ رائے یہ ہے:

قال الشیخ: ومن یصححہ یعتمد بعد تعدیل ابی قیس علی کونہ لیس مخالفاً لروایۃ الجمہور مخالفۃ معارضۃ بل ھو امر زائد علی ما رووہ ولا یعارضہ ولا سیما وھو طریق مستقل بروایۃ ھذیل عن المغیرۃ لم یشارک المشہورات فی سندھا۔ (نصب الرایہ، الجزء الاوّل مجلس علمی، ص۱۸۵)۔

(شیخ تقی الدین نے فرمایا: جن حضرات نے حضرت مغیرہؓ سے مروی جرابوں پر مسح والی حدیث کو صحیح قرار دیا ہے ان کا اعتماد اس امر پر ہے کہ اوّل تو ابوقیس ایک عادل راوی ہیں، پھر ان کی روایت کا اختلاف جمہور کی روایت سے معارضے کی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ ابوقیس والی روایت میں دوسرے راویوں کی روایت سے ایک زاید بات بیان کی گئی ہے، بالخصوص جبکہ ہذیل[1] کی حضرت مغیرہؓ سے روایت کردہ حدیث کی سند مستقل ہے جس میں دوسری مشہور روایتوں کے ساتھ اسناد میں اشتراک نہیں ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مغیرہؓ سے مسح علی الجوربین والی روایت اپنی جگہ ایک مستقل صحیح حدیث ہے اور مسح علی الخفین والی احادیث سے متصادم و معارض نہیں ہے۔ ملا علی قاری مرقاۃ شرح المشکوٰۃ میں حضرت مغیرہ سے مروی حدیث مسح علی الجوربین کے تحت فرماتے ہیں:

---

[1] مجلس علمی کے مطبوعہ نسخہ "نصب الرایہ" میں ہذیل ذ کے ساتھ چھپا ہے مگر دوسری کتابوں میں ہزیل ز کے ساتھ ہے۔

قد اجاز المسح فوق الجورب بين جماعة من السلف وذهب اليه نفر من فقهاء الامصار منهم سفيان الثوری واحمد واسحٰق وقال مالك بن انس والاوزاعی والشافعی لا يجوز المسح على الجوربين - رواه احمد والترمذی وقال حسن صحيح ورُدّ بان المعروف من رواية المغيرة المسح على الخفين واجيب بانه لا مانع من ان يروی المغيرة اللفظين وقد عضده فعل الصحابة ، قال ابوداود ومسح على الجوربين علی وابن مسعود وابو امامه وسهل بن سعد وعمرو بن حريث وروی ذالك عن عمر وابن عباس وهو اعم ان يكونا مجلّدين بان كان الجلد اعلاهما واسفلهما او منعلين بان كان الجلد اسفلها فقط او ثخينين مستمسكين على الساق فی قول ابی یوسف ومحمد وابی حنیفة آخرا وعليه الفتوی -

(سلف کی ایک جماعت نے جرابوں پر مسح جائز قرار دیا ہے اور فقہاء امصار کی ایک تعداد کا یہی مسلک ہے جن میں امام سفیان ثوری ، امام احمد ، امام اسحاق بن راہویہ شامل ہیں ۔ اور امام مالک ، امام اوزاعی اور امام شافعی اس کے جواز کے قائل نہیں ۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مسند احمد اور سنن ترمذی میں مروی ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے ۔ امام ترمذی کی تردید یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے معروف روایت مسح علی الخفین کی ہے ۔ مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے دونوں الفاظ (خفین اور جوربین) روایت کیے ہوں ، اور جرابوں پر مسح کو صحابہ کرام کے فعل سے تائید ملتی ہے ۔ امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ حضرت علی ، ابن مسعود ، ابوامامہ ، سہل بن سعد ، عمرو بن حریث حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے جرابوں پر مسح کیا ہے اور یہ جواز عام ہے ، اس کے ساتھ مشروط نہیں کہ جرابیں مجلد ہوں ، یعنی ان کے اوپر نیچے چمڑا چڑھا ہو یا منعّل ہوں ، یعنی چمڑا دونوں کے فقط نیچے ہو یا وہ جرابیں موٹی اور پنڈلی سے چمٹ جانے والی ہوں جیسا کہ امام ابو یوسف ؒ امام محمد کا قول ہے یا امام ابوحنیفہ کا بھی آخری قول ہے اور اس پر فتویٰ ہے) مرقاۃ ، ج ۲ ، ص ۶۸ ، مکتبہ امدادیہ ، ملتان ۔

امام علی القاری کی یہ انصاف پسندی اور دیانت ہے کہ انہوں نے اپنے مسلک حنفی کا فتویٰ بھی بیان

کردیا مگر اس سے پہلے یہ بھی واضح فرما دیا کہ مسئلہ اصحاب سلف اور فقہائے امت میں مختلف فیہ ہے۔ دونوں طرف احادیث و آثار ہیں اور جرابوں پہ جو قیود حنفیہ نے لگائی ہیں حدیث و آثار میں مذکور نہیں بلکہ وہ عمومی جواز پہ دلالت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مدیر البلاغ کا کہنا یہ ہے کہ احادیث و آثار میں باریک جرابوں کا ذکر نہیں، حالانکہ وہاں ذکر نہ باریکی کا ہے، نہ موٹاپے کا ہے۔ بہت سے علماء اور غیر علماء چمڑے کے باریک پائتابے جرابوں پہ سلوا کر ان پہ مسح کرتے ہیں۔ اگر اس باریک چمڑے پہ مسح ہوسکتا ہے تو جراب پہ کیوں نہیں ہوسکتا؟ جس طرح چمڑا، بہرحال چمڑا ہے خواہ دبیز ہو یا رقیق، اسی طرح جراب بہرحال جراب ہے خواہ موٹی ہو یا پتلی۔ دونوں کا مقصد پاؤں کو ڈھانکنا ہے اور کوئی موثر فرق دونوں میں نہیں۔

رُودادِ ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۵)

رات تیزی سے گزر گئی۔ پھر دم ہم ہشاش بشاش نیند سے بیدار ہوئے۔ وضو کیا اور صف بستہ ہو کر اللہ عزوجل کے حضور کھڑے ہو گئے۔ لامحدود قوت و طاقت کا احساس ہمیں اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ تعذیب کے خاتمے نے ہمارے دلوں میں اُمیدوں کے نئے چراغ روشن کر دیے تھے۔ نماز ادا کی۔ ہماری یہ نماز اُن نمازوں سے بدرجہا مختلف تھی جو ہم جیل کی دیواروں سے باہر گزارتے رہے ہیں۔ میں یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قلعہ کے اندر اپنے مخصوص حالات، اور جو کچھ میں دیکھتا رہا اُس کے اثرات کی وجہ سے ایک فرض نماز بھی ادا نہ کر سکا۔ تازیانۂ تعذیب کبھی منقطع نہ ہوتا تھا۔ دراصل قلعہ کا عالم محشر سے کم نہ تھا۔

اُدھر چڑیوں کے چہچہے تھے۔ اور اِدھر ہم مترنم اور شیریں آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ دونوں کی آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ ابوزعبل میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ اور ابھی تک ہم یہ نہ جان پائے تھے کہ ابوزعبل کے ایام تو قلعہ کے ایام سے زیادہ پُرہول اور رنج افزا ہوں گے۔ ہم یہ بھی نہ جان پائے تھے کہ عنقریب ہم قلعہ پہ یہ کہہ کر رحم کی دُعا کریں گے کہ نباشِ ثانی سے نباشِ اوّل ہی بہتر تھا۔ دھوپ نکل آئی۔ ہمارے لیے کھانا لایا گیا۔ کالا شہد جس سے ہم سب نے اپنی اپنی چھوٹی پلیٹ بھر لی۔ ردّی اور ناکارہ پنیر کا ایک ٹکڑا۔ خشک اور ٹھنڈی روٹی جس میں آٹے کے ساتھ کچھ دوسرے نادیدہ مادے بھی شامل تھے۔ بلکہ کچھ حشرات الارض بھی، جن میں سے کچھ کیڑے مکوڑوں کی میں نے شناخت کر لی۔ اور بیشتر شناخت نہ ہو سکے۔

کھانا کھایا اور گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ اُن لمحات تک ہمارا پختہ گمان تھا کہ اب آخر تک یہی سکون و اطمینان کی فضا ہمیں نصیب رہے گی۔ ناگاہ ایک فوجی افسر سلاخوں کے سامنے سامنے ہمارے پاس سے گزرا - اور پھر کھڑا ہو کر ہم سے باتیں کرنے لگا - یہ افسر بڑا معقول و متوازن آدمی تھا - تشدد و سخت گیری سے آشنا نہ تھا - تعذیب دینے میں بھی اس کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا - ایسے افراد کی ہمارے دل میں انتہائی قدر و منزلت تھی - یہ انہی افسروں میں سے ایک تھا جو قلعہ کے اندر میری تفتیش کرتے رہے ہیں۔ بلکہ یہ وہ واحد انسان ہے جس نے زدوکوب اور تعذیب و تشدد کے بغیر میرے ساتھ تفتیشی کارروائی انجام دی - لیکن اس کی باری یوں پلک جھپکتے میں گزر گئی گویا وہ کوئی سہانا خواب تھا جو میں نے گرمیوں کی ایک شدید گرم رات میں دیکھا تھا - مجھ سے بحث و مباحثہ کرتا رہا، پوچھ گچھ کرتا رہا، بڑے ایچ پیچ سے استفسارات کرتا رہا - اُس نے فہم و ذکاء کو استعمال کیا تھا، دست و عصا نہیں استعمال کیے تھے - اس افسر نے دروازے میں سے ہمارے ساتھ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں - اُس کی باتوں سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہماری آزمائش کا دَور ختم ہو گیا ہے - قلعہ کے اندر ہی جو کچھ گذری بس وہی مصیبت کی گھڑی تھی اب نظر بندی کا کچھ زمانہ درپیش ہو گا جو غالباً زیادہ طویل نہ ہو گا - بعض ساتھی تو خوشی سے بلیوں اچھلے اور اس خیال میں مگن ہو گئے کہ رہائی کا پروانہ آیا چاہتا ہے -

ان لوگوں کے اندر ایسے افراد بھی ان بیرکوں میں موجود تھے جو رہائی یا عدم رہائی کے تصورات سے بالا تھے - اُن کے پُرعزم چہروں پر پختہ عقیدے کے عمیق نقوش مرتسم ہو چکے تھے - ایمان باللہ کا سرور سرمدی ہر حالت میں اُن کو امن و سکون اور صدق و صفا کے نشے میں مدہوش رکھتا تھا - یہ وہ انسانی گروہ تھا جسے اخوان المسلمون کی تحریک نے امام حسن البنا کے دَور میں تیار کیا تھا - ان لوگوں میں سے تین کے نام مجھے بخوبی یاد آ رہے ہیں - خدا جانے وہ اب کہاں ہیں: ایک شیخ حامد الطحان، دوسرے استاذ محمود عبدہ جو ۱۹۴۸ء کے جہاد فلسطین میں اخوان کے دستوں کے ایک کمانڈر رہے ہیں - اور تیسرے الحاج عبدالرحمن حسب اللہ، جو ان چھ اشخاص میں سے ایک ہیں جنہوں نے ۱۹۲۸ء میں اسماعیلیہ شہر میں اخوان المسلمون کی داغ بیل ڈالی تھی - صرف ایک نظر ان لوگوں کو دیکھ لینا اس امر کے لیے کافی تھا کہ انسان کے دل میں اللہ پر اعتماد و یقین کا جذبۂ فراواں اُمڈ آئے، اور ابتلاء و عذاب برداشت کرنے کے لیے اُس کے اندر قوت و حوصلہ کا بحرِ بیکراں موجزن ہو جائے -

دوسری طرف ابوزعبل کے پہلے ہی روز ایسے انسانی نمونے بھی نظر آئے جو عزم و ثبات کے لحاظ سے کم تر اور خوف و قلق میں سب سے بڑھ کر تھے۔ ہمارے ساتھ وزارتِ تعلیم کا ایک انسپکٹر تھا، بڑا ڈرپوک، بڑا بزدل اور انتہائی کنجوس۔ اس نے داروغہ جیل کے پاس پانچ پونڈ کی امانت جمع کرا رکھی تھی۔ چنانچہ بار بار وہ یہ ذکر کرتا رہتا کہ اگر انٹیلی جنس والے اس کی جان بخشی کر دیں تو وہ اپنے پانچ پونڈ انہیں بخشنے کے لیے تیار ہے ——— اسے کیا خبر تھی کہ اس قضیے کا مقابلہ کرنا اس کے پانچ پاؤنڈوں کے بس میں نہیں ہے۔

ہم عالم سرخوشی میں بیٹھے اس پائلٹ کے لطائف سنتے رہے جسے اپنی زندگی میں کبھی ایسے تاریک حالات کا سامنا کرنے کا خیال نہ آتا تھا۔ وہ پائلٹ اصل قضیے سے ناواقفیت کی وجہ سے جو مضحکہ خیز حرکتیں کرتا رہا اسے سن سن کر سب بے تحاشا ہنستے رہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اس تصور میں مگن تھے کہ اس دلکش کیمپ میں ہم یوں رہیں گے گویا چھٹیوں کے خوشگوار دن گزار رہے ہیں۔ مگر چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ پھر ہمارے دل بیٹھنے لگے اور غم و اندوہ کے جذبات طاری ہو گئے۔ جیل کے اندر غیر معمولی ہلچل شروع ہو گئی، دار و گیر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ ایک حوالدار ہمارے پاس آیا جو بڑا ترش رو اور غلیظ القلب تھا۔ اسے "ملّا" کہتے تھے۔ وہ حاضرین کے نام پوچھنے لگا اور اپنے مبروص ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے کاغذات میں درج کرنے لگا۔ تمام بیرکوں سے گزرا اور نظر بندوں کے نام نوٹ کرتا گیا۔

جیل کے ملازمین قیدیوں کا مخصوص لباس لے کر آ گئے۔ اگرچہ یہ لباس استعمال شدہ نہ تھا مگر جوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ جس کپڑے سے تیار کیا گیا تھا وہ کپڑا نہیں تھا ٹاٹ بدرنگ تھا۔ بڑا بے ڈھب اور غیر موزوں لباس۔ ہم نے اپنا اپنا جو لباس پہن رکھا تھا حکم دیا گیا کہ اسے اتار کر ان کے سپرد کر دیا جائے۔ ہمیں جو پاجامے ملے وہ کسی صورت بھی جسم پر درست نہ بیٹھ رہے تھے۔ قمیض بھی بڑی متعفن اور بھدی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انہیں عرصہ طویل تک غلاظت میں بھگو کر رکھا گیا ہے۔ ٹوپی جو ملی وہ بھی انتہائی بدنما۔ ان دنوں گرمی شدید تھی۔ چنانچہ ایک طرف گرمی کی شدت ... م گھٹا جا رہا تھا اور دوسری طرف اس کھردرے اور بے ڈھب لباس نے جان ضیق میں کر دی۔ بلکہ ہمارا پائلٹ ساتھی ... جو ہمیں اپنی دلچسپ کہانیاں سناتا رہتا تھا، "نیا لباس" پہننے کا حکم سن کر پھوٹ ... رونے لگا۔ اور خدا کا ...

دے کر کہنے لگا کہ اُس کے پاس اُس کا اپنا لباس ہی رہنے دیا جائے جو وہ لندن سے لے کر آیا ہے۔ مگر حوالدار مُلّا نے اُس سے کہا: "خدا کا شکر ادا کر کہ تجھے زندہ چھوڑ دیا گیا ہے"۔

دروازے کی سلاخوں میں سے ہم نے جھانک کر دیکھا کہ سپاہی لاٹھیوں، بید کی چھڑیوں اور چرمی چابکوں کی بھاری مقدار جیل کے اندر لا رہے ہیں جو پورے بد اعظم کی کھال اُتارنے کے لیے کافی ہے۔ یہ دہشت انگیز انبار وہ جیل کے فرش پر لا کر پھینک رہے ہیں جس کی آواز سنتے ہی بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہو جائے۔ ہمارے ایک ساتھی کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات جاری ہو گئے: "یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوْا وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" (اے ایمان والو! جب تمہاری دشمن گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو کثرت سے اللہ کو یاد کرو۔ شاید تمہیں فلاح نصیب ہو جائے)۔ اس آیت نے حاضرین کے دلوں پر جادو کا اثر کیا۔ پوری بیرک ذکر الٰہی اور تلاوت قرآن سے گونج اُٹھی۔ اور دلوں کے اندر طمانیت و سرمستی کی لہر موجزن ہو گئی۔

اسی اثنا میں ایک گرجدار آواز بلند ہوئی جس نے جیل کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ بیرک کے تمام لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ دراصل باہر مجھے آواز دی جا رہی تھی۔ یکایک مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ اس آواز کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے جسے وہی سمجھ سکتا ہے جو کبھی اس جگہ آیا ہو— اب تک ہم نے آرام کی جو گھڑیاں گزاری ہیں وہ خواب تھیں، سراب تھیں۔ لقد جاءت الصاخۃ وما ادراک ما الصاخۃ (بلند ہوئی چنگھاڑ، اور تو کیا جانے کہ کیا ہے یہ چنگھاڑ)۔ ہم دوبارہ غم میں ڈوب گئے۔ خدا جانے کب یہ آزمائش ٹلے گی۔ کب آئے گی کشادگی اے خدائے دیگر!

بیرک کے بوڑھے ساتھی میرے قریب آ گئے اور مجھے کان میں قرآن کریم کی آیات سنانے لگے۔ میں دروازے کی جانب بڑھا تاکہ دُور سے پکارنے والے کو میں نظر آ جاؤں۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً میرے سامنے آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں کنجی تھی۔ اس نے بیرک کا دروازہ کھولا اور مجھے وہاں سے باہر لے گیا۔ اُس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اندھے کی طرح وہ مجھے ننگے پاؤں لے چلا۔ پٹی بڑی کس کر باندھی گئی تھی اس لیے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھے کبھی اُوپر چڑھاتا اور کبھی نیچے اُتارتا۔ پھر مجھے ایک ایسی زمین پر لے گیا جہاں خشک گھاس اور کانٹے تھے۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ مجھے جیل کے باہر کسی اور جگہ لے آیا ہے۔

ایک خوفناک آواز پر میں چونکا۔ اس آواز کو میں خوب پہچانتا تھا۔ یہ میجر ف۔ ع کی آواز تھی۔ اس شخص نے قلعہ کے اندر بھی دوران تفتیش مجھ پر قیامت ڈھائی تھی۔ میجر ف۔ ع نے بڑے متکبرانہ اور پریشان کن انداز کے ساتھ مجھے کہا،

آگئے ہو؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

تمہاری قسمت بہت کھوٹی ہے۔

میں نے دبی آواز میں کہا: کیوں؟

کیا فی الواقع تم نہیں جانتے کہ تمہاری قسمت کیوں کھوٹی ہو رہی ہے؟

اس کے بعد اس نے پے در پے گندی اور فحش گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ اور پیشتر اس کے کہ میں کوئی جواب دیتا مجھ پر لکد کوبی کی بارش ہونے لگی۔ چند لمحات بعد مجھے کسی جگہ اٹھا کر لٹکا دیا گیا۔ میرے ارد گرد تاریکی ہی تاریکی تھی جو آنکھوں پر پٹی بندھ جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ڈنڈے کی چوٹیں مخصوص اور متواتر انداز میں میرے پیروں پر لگ رہی تھیں۔ اور میں ایسے کرب میں مبتلا ہو گیا کہ اس کے سامنے موت آسان نظر آتی تھی۔ میں سخت گھبرا گیا۔ میں نے بار بار درخواست کی کہ آخر میں مسلمان ہوں اور تمہارے جیسا ایک مصری باشندہ ہوں۔ لیکن اس کا اصرار تھا کہ میں کچھ کہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ نہ وہ جانتا تھا اور نہ میں کہ کیا کہوں اور کس راز سے پردہ اٹھاؤں ———— یہ تعذیب کا ایک دور تھا۔ اور بھی کئی دور آئے۔ جب بھی مجھے تعذیب کے لیے جانا ہوتا میں دل میں عہد کرتا کہ چیخ پکار نہیں کروں گا اور نہ زبان پر کوئی حرفِ شکایت لاؤں گا۔ مگر ہر بار میں یہ عہد نبھانے میں ناکام رہا ———— جی ہاں، ہر مرتبہ اس میں ناکامی ہوئی یہ تعذیب انسانی مخلوق کی برداشت سے باہر تھی۔ یا کم از کم میری برداشت سے بالا تھی۔

زدوکوب کی پہلی "گرم گرم خوراک" لینے کے بعد میرے تمام جوڑ بند کھل گئے۔ اور میں نیم جاں ہو گیا۔ انہوں نے میری رسیاں کھول دیں اور ٹکٹکی سے نیچے اتار دیا۔ اور پھر مجھے ڈنڈے کی مار کے ساتھ یہ حکم دیا کہ میں پاؤں کے بل چھلانگیں لگاؤں تاکہ پاؤں میں ورم نہ پیدا ہو، اور پیپ نہ بھر جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ رحمدلی کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ اس بنا پر تھا کہ اگلے دور تعذیب کے لیے جب مجھے طلب کیا جائے تو مجھ میں اسے برداشت کرنے کی کچھ ہمت ہو۔

(باقی)

مطبوعات

علوم القرآن اور اصولِ تفسیر | مؤلف : مولانا محمد تقی عثمانی

صفحات : ۵۱۰ قیمت : ۲۷/- روپے

زیرِ نظر کتاب ، بقول فاضل مصنف ، علوم قرآنی پر کوئی مستقل تالیف کے ارادے سے نہیں لکھی گئی بلکہ انہوں نے جب قرآن مجید کی ایک اردو تفسیر کے لیے مقدمہ لکھنے کا ارادہ کیا اور مباحث طویل ہو گئے تو انہیں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں علوم القرآن سے متعلق تمام اہم امور کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے ، پہلے حصے میں علوم قرآنی سے متعلق آٹھ ابواب ہیں جن میں وحی اور اس کی حقیقت ، نزولِ قرآن کی تاریخ ، سبعہ احرف ، ناسخ و منسوخ ، شانِ نزول ، حفاظتِ قرآن اور اس سے متعلقہ شبہات کا ازالہ ، حقانیت قرآن اور مضامین قرآن کے مباحث شامل ہیں ۔ دوسرا حصہ علم تفسیر اور اصول تفسیر سے متعلق ہے اور اس میں تفسیر کے ماخذ ، اصول تفسیر ، صدر اول کے بعض مفسرین کا تعارف اور متاخرین کی چند تفسیروں پر نقد و تبصرہ درج ہے ۔

فاضل مؤلف نے دوسرے باب میں انزال اور تنزیل کے استعمال میں فرق بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ "انزال کے معنی ہیں " ایک ہی دفعہ مکمل نازل کر دینا " اور تنزیل کے معنی ہیں " تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا " یہ بات اگرچہ بہت سے مفسرین نے بھی کہی ہے لیکن اسے قاعدہ کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ قرآن حکیم نے بعض مقامات پر ان دونوں الفاظ کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا ہے مثلاً :

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (النساء - ۱۱۲)

وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ

اور سورۂ فرقان کی آیت ۳۲ ملاحظہ ہو :

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۔

ہمارے ہاں علوم قرآنی کے ضمن میں سبعہ احرف کی بحث بڑی معرکہ آرا ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب میں بھی اس

مسئلہ پر طویل بحث کی گئی ہے۔ اس کے باوجود بات کسی حد تک تشنہ معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ معاملہ صرف یہ ہے کہ آنحضورؐ نے آغاز میں لوگوں کی سہولت کے پیش نظر اہل قریش کے لہجہ ـــ جس لہجے میں قرآن اترا ہے۔ کے علاوہ دیگر قبائل کو ان کے اپنے لہجوں میں قرآن پڑھنے کی اجازت فرمائی تھی۔ بعد میں جب عجمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو اس اختلافی صورت کو دور کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ نے پوری امت مسلمہ کو پھر اہل قریش کے لہجہ میں قرآن کی تلاوت کرنے پر متفق اور مجتمع کر دیا۔

ناسخ و منسوخ کی بحث بڑی فکر انگیز ہے اور اس کے ہر گوشے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور اس ضمن میں پیدا شدہ اور پیدا کردہ تمام شبہات کو نہایت خوبی سے رفع کر دیا گیا ہے۔ متن قرآن کی صحت و حفاظت پر کیے گئے مستشرقین کے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی موجود ہیں۔

قرآن کی تفسیر کے چھ ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں اقوالِ صحابہ اور تابعین کے اقوال کو اگر آثار صحابہ کے نام سے ایک ہی ماخذ قرار دیا جاتا تو بہتر تھا۔ پھر عقل سلیم کو بھی تفسیر کے لیے ایک ماخذ بتایا گیا ہے اسے "آخذِ تفسیر" تو کہا جا سکتا ہے مگر اسے ماخذِ تفسیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آخر میں اردو تفاسیر کا تعارف کراتے ہوئے فاضل مؤلف نے صرف 'بیان القرآن' اور 'معارف القرآن' پر اکتفا کیا ہے حالانکہ تعارف کے لیے اردو میں ان کے علاوہ اور بہت سی گرانقدر تفسیریں موجود ہیں۔

سورۂ ہود کی ایک آیت لکھتے ہوئے (ص ۳۰) اعراب غلط لگ گئے ہیں۔ اِصنع کے بجائے اَصنُع اور وَحَینا کے بجائے وَحِیُنا لکھ دیا گیا ہے۔ دو صفحات میں عبارت کی ترتیب الٹ گئی ہے۔ ص ۲۵۶ پر ۲۵۷ کی عبارت درج ہو گئی ہے اور ص ۲۵۷ پر ۲۵۶ کی۔

بایں ہمہ اردو زبان میں علوم القرآن کے اہم مباحث کی توضیح و تشریح کی یہ ایک قابل قدر کوشش ہے۔

(بقیہ اشارات) جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن پاکستان میں پولیس اور فوج کی درندگی کا نشانہ بننے والے بے بس افراد پر انہیں کوئی رحم نہیں آتا، بلکہ ظلم کرنے والی مستبد حکومت اور اُس کے حکم کے تحت غریب، نہتے اور بے بس عوام پر ظلم کے پہاڑ توڑنے والے سرکاری ادارے ملت کے ان بداندیشوں سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہیں۔

اہلِ پاکستان پر یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اُس نے اپنی بے پایاں عنایات سے انہیں یہ توفیق دی کہ وہ اپنے گروہی تعصبات کو چھوڑ کر ایک فاشسٹ حکمران کے مقابلے میں متحد ہو گئے اور اس کے جبر و استبداد کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر کے اُسے یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ یہ ملک نہ تو اس کی میراث ہے اور نہ اس ملک کے باشندے اس کے غلام ہیں کہ وہ جس طرح چاہے ان سے معاملہ کرے۔ عوام نے اپنی جدوجہد سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ ملک اسلامی نظام کے لیے مختص ہو چکا ہے اور اس میں اقتدار خالقِ کائنات کی مقدس امانت ہے جسے مالکِ حقیقی کے منشاء کے مطابق ہی استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہاں کے بسنے والے خدائے واحد کے بندے ہیں اور صرف اسی ایک کی بندگی کو صحیح سمجھتے ہیں اور باقی ہر نوع کی دوسری بندگی کے شدید مخالف ہیں۔ ان کی زندگی کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ نوعِ بشری کو جھوٹے خداؤں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی کا سلیقہ سکھایا جائے اور انسان نے اپنی حماقت سے جو معبودانِ باطل بنا رکھے ہیں، ان بتوں کو اپنی ضربِ کاری سے پاش پاش کر کے حق کا کلمہ بلند کیا جائے۔

قرآن حکیم کا نچوڑ آسان اُردو میں پڑھیے

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی ۱۴ وحدت روڈ لاہور نے قرآن مجید کا نچوڑ **۲۶** خوبصورت دیدہ زیب کتب کی صورت میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب چھپ گئی ہیں ان کتابوں کو تیسری اور اس سے اونچی جماعت کا طالب علم پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ ان کو سن کر قرآن حکیم سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ سب سے زیادہ مہربان انسان
۲۔ سب سے بڑے جرنیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ بچوں کے لیے نماز مترجم
۴۔ بچوں سے پیار کرنے والے رسولؐ
۵۔ جان اور مال سے جہاد کرنے والے مجاہد حصہ اول
۶۔ جان اور مال سے جہاد کرنے والے مجاہد حصہ دوم

کتاب نمبر ۷ تا ۱۶ قصص القرآن حصہ اول تا دہم (دسواں) اس میں حضرت آدمؑ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے حالات قرآن حکیم کے مطابق درج کیے گئے ہیں اور ہر قصے کے آخر میں اس کے نتائج بھی دیے گئے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے احکام تسلیم کیے وہ نوازے گئے اور جنہوں نے نافرمانی کی وہ نیست و نابود کر دیے گئے۔

کتاب نمبر ۱۷ تا ۲۶۔ ان میں قرآن حکیم کے دیگر مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ حقوق والدین۔ حقوق زوجین۔ حقوقِ اولاد۔ حقوق ہمسائیگاں۔ معراج وغیرہ وغیرہ۔ اس کا نام احکام الٰہی و فرمان رسول حصہ اول تا دہم ہے۔ یہ زیر تصنیف ہیں۔

۱ تا ۱۶ کتابوں کی قیمت سوائے کتاب نمبر ۱۶ فی کتاب مبلغ تین روپے ہے۔ کتاب نمبر ۱۶ جو ۳۲۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت ۵/- روپے ہے۔ ان کتابوں کو خود خرید کر پڑھیں۔ اپنے بچوں کو پڑھا کر اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو سنا کر قرآن حکیم کا نور پھیلائیں اور اپنے دین و دنیا۔ آخرت کو بہتر بنائیں۔

یہ سب کتابیں سوسائٹی اور کتب فروشوں سے مل سکتی ہیں

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی ۱۴ وحدت روڈ لاہور
فون نمبر ۳۵۳۳۸۹